بٹ تمیزیاں
ڈاکٹر محمد یونس بٹ
I am not an ordinary person

فہرست

بٹ تمیزیاں

آج کل سب سے زیادہ مزاح اخباروں کے صفحہ اول پر ہوتا ہے۔ اب لوگ اتنا ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کو پڑھ کر نہیں ہنستے' جتنا صفحہ اول پر چھپنے والے بیانوں پر ہنستے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسے ہی لوگ مزاح کو فروغ دے رہے ہیں۔ فکاہیہ کالم نگار' آرٹ بکوالڈ اپنی محبوبہ کے ساتھ کوالٹی ان موٹل میں مقیم تھا کہ باتوں باتوں میں اس کی محبوبہ نے پوچھا: ''آپ کے کالموں میں جو مزے مزے کے مضامین ہوتے ہیں وہ آپ کے ذہن میں کیسے آتے ہیں؟'' آرٹ بکوالڈ نے کہا: ''مجھے ڈر تھا کہ تم یہ پوچھو گی۔ دیکھو! کتنی حسین شام ہے تم اسے ایسی باتوں سے برباد کرنا کیوں چاہتی ہو؟'' محبوبہ نے ضد کی۔ آرٹ بکوالڈ نے بہتیرا کہا کہ اگر میں نے سچ سچ بتادیا تو تمہاری نظر میں میرا جو مقام ہے وہ نہیں رہے گا۔ محبوبہ اڑی رہی تو آرٹ بکوالڈ نے کہا: ''سچ تو یہ ہے کہ میرا ہر آئیڈیا چوری کا ہوتا ہے۔'' محبوبہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا: ''یہ نہیں ہو سکتا تم تو دور حاضر کے سب سے بڑے کالم نگار ہو۔'' آرٹ بکوالڈ بولا: ''یہ حقیقت ہے کہ میں اپنا کالم اخباروں اور ٹی وی سے چراتا ہوں۔ میرے کالم کا آئیڈیا کبھی ڈان رادر کا ہوتا ہے' کبھی جان چانسلر اور کبھی اداکار باربرا والٹرز سے چرایا ہوا۔'' یہ سن کر محبوبہ بستر سے اچھلی

اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی کہ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ رات نہیں گزارنا چاہتی جو باربراوالٹرز کا آئیڈیا بھی چوری کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے بھی یہ مزاحمین نواز شریف سے بابرہ شریف اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری سے مولانا فضل الرحمٰن تک سے اڑائے ہیں۔ ہم پیرپگاڑو' نوابزادہ نصراللہ خان اور مسرت شاہین صاحبہ کے بھی مشکور ہیں' جنہوں نے اپنی ''حرکات'' و ''باتیات'' سے مزاح کو فروغ دیا۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ
A - 164 جوہر ٹاؤن لاہور
فون:- 042 - 840998

لاف لائن

سیاست دنیا کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے اور اس میں وہ سب چلتا ہے' جو دنیا کے پہلے قدیم پیشے کے لیے ضروری ہے۔ مسرت شاہین صاحبہ اب دوسرے قدیم ترین پیشے سے منسلک ہیں۔ یہ ان لوگوں کی پسندیدہ لیڈر ہیں' جنہیں ایسی لیڈر پسند ہوتی ہیں۔ فلموں میں مسرت شاہین کا وہ مقام تھا' جو علماء میں مولانا فضل الرحمٰن کا ہے اور سیاست میں مسرت شاہین کا وہ مستقبل ہے جو فلموں میں مولانا فضل الرحمٰن کا ہو سکتا

ہے۔ ہم مسرت شاہین کو ملنے گئے تو پہچان نہ پائے' حالانکہ ہم نے ان کی بیشتر فلمیں دیکھی ہیں۔ ہمارے لیے انہیں پہچاننا شاید اس لیے مشکل تھا کہ وہ اب بہت بدل گئی ہیں یا پھر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کی فلموں میں چہرہ کم ہی دکھایا جاتا ہے۔ مسرت شاہین صاحبہ سے گفتگو کرنا ایک تعلیمی کام ہے' کیونکہ وہ باتوں باتوں میں آپ کو کوئی نہ کوئی سبق ضرور سکھا جاتی ہیں۔

سوال: آپ کا تعلق کس خاندان سے ہے؟

مسرت شاہین: میرا تعلق اپنے والد کے خاندان سے ہے۔ ہمارا گھرانہ اتنا مذہبی تھا کہ والد نے باورچی خانے میں پریشر ککر رکھنے سے منع کر رکھا تھا کہ گھر میں بچیاں ہیں اور یہ سیٹیاں مارتا ہے۔

سوال: آپ کب پیدا ہوئیں؟

مسرت شاہین: یاد نہیں' کیونکہ جب میں پیدا ہوئی تو بہت چھوٹی تھی۔

سوال: آپ کے والد آرمی میں تھے۔ سنا ہے وہ بڑے بڑے عرصے کے بعد گھر آتے تھے؟

مسرت شاہین: ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہم سات بہن بھائی ہیں اور کسی کی عمر کا فرق ایک سال سے زیادہ نہیں۔

سوال: آپ بڑی ہو کر کیا بننا چاہتی تھیں؟

مسرت شاہین: ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹری کے لیے حکومت نے جو پہلے میٹرک پاس کرنے کی شرط رکھی ہے' یہ بہت کڑی ہے۔ اب میں بڑی ہو کر نوابزادہ نصراللہ خان بننا چاہتی ہوں۔

سوال: نوابزادہ نصراللہ خان بننا آپ کے بس کی بات نہیں' اتنا حقہ آپ پی ہی نہیں سکتیں' ویسے آپ کی فلمیں دیکھ کر تو لگتا ہے کہ آپ گاندھی جی بننا چاہتی تھیں؟

مسرت شاہین: (رونے لگتی ہیں) یہ سب کیمرہ ٹرک ہے میں تو ڈانس میں بھی صرف پیر ہی ہلاتی تھی۔ باقی سب کچھ کیمرہ مین کرتا تھا۔ (وارڈروب دکھاتے ہوئے) یہ سب میرے کپڑے ہیں۔ مجھے بھلا گاندھی بننے کی کیا ضرورت تھی۔

سوال: لباس کے بارے میں آپ کی رائے؟

مسرت شاہین: پہننا چاہئے۔

سوال: آپ پشتو فلموں کی بہت بڑی اداکارہ تھیں اب بھی ہیں؟

مسرت شاہین: نہیں! اب میں نے ویٹ کم کر لیا ہے۔

سوال: سنا ہے پشتو فلموں میں آپ سب سے زیادہ معاوضہ لیتی تھیں' کتنا تھا؟

مسرت شاہین: دو ہزار روپے فی کلوگرام۔

سوال: آپ کس قسم کا رقص کر لیتی ہیں؟

مسرت شاہین: میں صرف ہر قسم کا رقص کرتی ہوں۔ میں نے دنیا کے رقص دیکھے ہیں' لیکن ہمارا رقص سب سے "جاندار" اور "صحت مند" ہے۔ میں نے روسی لڑکیوں کا بیلے دیکھا۔ لڑکیاں پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑی ہو کر ناچ رہی تھیں۔ رقص کے بعد ان کا منیجر میرے پاس آیا اور میری رائے پوچھی تو میں نے کہا لڑکیوں کو پنجوں کے بل نچانے کے بجائے آپ لمبی لڑکیاں کیوں نہیں لے لیتے' وہ لاجواب ہو گیا۔

سوال: پشتو فلمیں بنانے والوں کو کوئی مشورہ دینا چاہیں گی؟

مسرت شاہین: وہ صرف اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔

سوال: آج کل کی فلموں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

مسرت شاہین: عجیب فلمیں ہیں' اکیلا بندہ تو انہیں دیکھ ہی نہیں سکتا۔

سوال: آج کل اداکارائیں بہت محنت کرتی ہیں۔ اداکارہ میرا نے فلم "ڈریم گرل" میں جسم پر پینٹ کروا کے گانا پکچرائز کروایا۔ اس گانے کی وجہ سے وہ ہفتہ بستر سے نہ اٹھی۔

مسرت شاہین: اس گانے کو دیکھنے والے بھی ہفتہ بستر سے نہیں اٹھتے۔

سوال: آپ حسینہ ایٹم بم کہلاتی تھیں' یہ ایٹم بم سیاست پر گرا۔ فلم اور سیاست میں کیا فرق لگا؟

مسرت شاہین: کوئی فرق نہیں' بس وہاں میرا اپیئر بدر منیر کے ساتھ تھا' یہاں

مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ ہے۔

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں آپ مولانا کے اس لیے خلاف ہیں کہ ان کی شکل آپ کے آئندہ خاوند سے ملتی ہے؟

مسرت شاہین: (ناراض ہو کر) اتنا مجھے پشتو فلم کے ڈائریکٹروں نے نہیں اچھالا جتنا آپ جرنلسٹوں نے اچھالا ہے۔

سوال: آج کل آپ سیاسی کتابوں کا مطالعہ کر رہی ہیں' اس سے کچھ فائدہ ہوا؟

مسرت شاہین: کیوں نہیں' اب میں بغیر نیند کی گولی کے سو جاتی ہوں۔

سوال: سابقہ الیکشنوں میں آپ صرف ایک سیٹ سے کھڑی ہوئیں' آپ کو جنہوں نے فلموں میں دیکھا ہے ان کا خیال تھا ایک سیٹ آپ کے لیے تھوڑی ہے؟

مسرت شاہین: آئندہ الیکشنوں میں' میں سات سیٹوں سے کھڑی ہو رہی ہوں۔

سوال: کس طرف سے کھڑی ہوں گی؟

مسرت شاہین: چاروں طرف سے۔

سوال: کشمیر میں گینگ ریپ کی خبریں پڑھ کر آپ نے کہا تھا مجھے وہاں بھجوایا جائے' کیوں؟

مسرت شاہین: میں ان کے درد بانٹنا چاہتی ہوں۔ اپنوں کے لیے میں مسرت اور ظالموں کے لیے شاہین ہوں۔ جہاں کسی عورت کی عزت لوٹی جاتی ہے تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں وہاں کیوں نہ تھی۔

سوال: آپ کو کون کون سے لیڈر پسند ہیں؟

مسرت شاہین: ایسے سوال نہ پوچھیں۔ میرے خاوند بُرا مناتے ہیں۔

سوال: آپ کو اپنے خاوند کی سب سے اچھی بات کون سی لگتی ہے؟

مسرت شاہین: ان کی شکل آصف زرداری سے ملتی ہے۔ وہ میرے ساتھ اس لیے تصویر نہیں کھنچواتے کہ لوگ مجھے بینظیر نہ سمجھنے لگیں۔

سوال: آپ تو بینظیر کے سٹائل میں دوپٹہ' تسبیح اور تذکرہ کرتی ہیں۔ آپ تو بینظیر لگنا چاہتی ہیں؟

مسرت شاہین: نہیں' مجھے جس روز کوئی بینظیر کہہ دے مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ آج میرے کپڑوں کا پرنٹ اچھا نہیں۔

سوال: آپ کو نواز شریف کی کون سی بات پسند ہے؟

مسرت شاہین: ان کا ہیئر سٹائل۔

سوال: میرا آخری سوال ہے کہ آٹھویں ترمیم کے بعد صدر ہونا آپ کو کیسا لگتا ہے؟

مسرت شاہین: ایسے ہی جیسے ہالی وڈ میں خاوند ہونا۔

نیم کی ملکہ

ہمارے ہاں جتنی بھی ملکائیں ہیں، سب فلمی ہیں۔ سو ہمیں غیر فلمی ملکہ دیکھنے کا اتنا ہی شوق تھا، جتنا منور ظریف کی فلمیں دیکھنے کا ہے۔ ویسے بھی ہم شاہی خاندان اور شاہی محلے کی خبریں سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔ عرصہ تک جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کی خوبیوں میں ہم یہ بھی لکھتے رہے کہ وہ ملکہ ترنم بھی تھیں، ایسے ہی ملکہ الزبتھ کا ذکر آتا تو ہم مادر ملکہ کے بجائے میرج ملکہ الزبتھ ٹیلر مراد لیتے۔ اب پتہ چلا کہ ملکہ الزبتھ کا

خاوند تو ایک سے بھی کم ہے۔ ان کے خاوند پرنس فلپ گھر جوائی ہیں اور گھر جوائی آدھا خاوند ہوتا ہے۔ پرنس فلپ کو ملکہ کا خاوند ہونے کا ملکہ حاصل ہے۔ پہلے زمانے میں ملکہ کا خاوند نہ ہوتا تھا، بلکہ ایک بادشاہ ہوتا تھا۔ 1953ء میں مصر کے شاہ فاروق نے کہا: "ایک وقت آئے گا جب دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کے اور ایک برطانیہ کا۔" اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ برطانیہ کے پاس بھی بادشاہ نہیں رہا، ملکہ سے گزارا کر رہے ہیں۔ وہ برطانیہ، جس کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، اب کئی کئی دن سورج طلوع نہیں ہوتا۔ لندن میں ہر وقت دھند اور سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ برنارڈ شا کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ سنجیدگی دھند کی وجہ سے ہوتی ہے یا سنجیدگی کی وجہ سے دھند چھائی رہتی ہے۔ بہر حال برنارڈ شا نے کہا تھا: "انگریزوں کی زندگی سے تمباکو اور جوا نکال دیں تو باقی کتنے بچتے ہیں! البتہ انگریز میں یہ خوبی ہے کہ وہ اکیلا بھی ہو تو اپنے لیے لائن بنا لیتا ہے۔"

انگریز اپنی ملکہ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جب کوئی بحری جہاز بہت پرانا ہو جائے تو اس کا نام ملکہ کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے بھی اکثر جہازوں کے نام مغل بادشاہوں کے ناموں پر ہیں۔ جس کی وجہ ہمارے مزاح نگار دوست نے یہ بتائی کہ یہ جہاز ہم نے مغل بادشاہوں ہی سے تو خریدے ہیں۔ ملکہ جتنے دن ہماری مہمان رہیں، انہوں نے ہمارا نمک نہیں کھایا، اپنا پرہیزی کھانا انگلینڈ سے منگواتی رہیں۔ حالانکہ انگریز خانسامے ایسے ہوتے ہیں کہ کسی نے جنت اور جہنم کا فرق یہ بتایا تھا کہ: "جنت میں انگریز پولیس، فرانسیسی خانسامے، اطالوی عشاق، سوئس انتظامیہ اور جرمن مکینک ہوں گے جبکہ جہنم میں فرانسیسی انتظامیہ، اطالوی مکینک، سوئس عشاق، جرمن پولیس اور انگریز خانسامے ہوں گے۔" ملکہ اپنا کھانا ساتھ لائی ہے تو کیا ہوا ہمارے حکمران بھی جب برطانیہ جاتے ہیں تو سب کچھ یہاں سے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی باتیں سننے اور تالیاں بجانے کے لیے بندے بھی...... ہم نے ملکہ کو ایوان صدر میں رکھا جبکہ ہمارے صدر وہاں چلے جائیں تو انہیں دور سے بکنگھم پیلس دکھا کر لوٹا دیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ

کرتے ہیں کہ دور سے ملکہ دکھا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اخبارات نے ملکہ پر خصوصی نمبر شائع کیے جبکہ ہمارے وزیراعظم محمد خان جونیجو جب دورے پر برطانیہ گئے تو ان کی آمد کی خبر ڈھونڈنے میں پاکستانی سفارتخانے کے عملے کو چار گھنٹے لگے اور یہ خبر تلاش گمشدہ والے صفحے پر ملی۔

ملکہ جاتے جاتے ہمارے ملک میں نیم کا پودا لگا گئیں۔ ریڈیو تہران نے کہا: ''مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جماعت کو برطانیہ کی طرف سے کاشت کردہ نیم کا پودا قرار دیا تھا۔ ملکہ نے دوسرا پودا بھی لگا دیا تاکہ پہلے کی کڑواہٹ ختم ہو تو دوسرے پودے کی کڑواہٹ مسلمانوں میں موجود رہے۔'' ہم ملکاؤں کے بارے میں کچھ کہنے سے پرہیز ہی کرتے ہیں۔ روم کے ایک کالم نگار نے اپنی ملکہ کو مقدس گائے لکھ دیا تو گائے کہنے پر ملکہ نے کیس کر دیا۔ کالم نگار کو عدالت نے جرمانہ کیا' جسے ادا کرنے کے بعد اس نے کہا: ''یہ طے ہو چکا کہ ملکہ کو گائے نہیں کہا جا سکتا' لیکن کیا قانون گائے کو ملکہ کہنے پر جرمانہ کر سکتا ہے؟'' عدالت نے کہا: ''اس پر ہتک عزت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔'' تو کالم نگار نے منہ ملکہ کی طرف کیا اور بولا: ''جی ملکہ!'' ہمارے ہاں کسی نے ملکہ سے اپنا کوئی نہ کوئی رشتہ نکالا۔ بیگم عابدہ حسین کی تو ملکہ سے گھوڑوں کی طرف سے رشتہ داری نکل آئی۔ لیکن کسی ایسے رشتہ دار کو ملکہ سے نہ ملنے دیا گیا' جیسی رشتہ داری ملکہ کی قبائلی سردار سے نکلی تھی۔ افریقہ جب برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا تو ملکہ وہاں گئی۔ ایک قبائلی سردار نے ضیافت میں اعلان کیا کہ ''ملکہ سے میرا خون کا رشتہ ہے'' ملکہ کو حیرانی ہوئی تو اس قبائلی نے کہا ''باپ کی طرف سے میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے'' ملکہ نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا ''میرے باپ نے شاہی خاندان کے ایک فرد کو کھایا تھا۔''

خر...... آٹے

شاعری پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نہ پڑھیں تو نقصان نہیں ہوتا۔ ہم نے پچھلے دنوں لفظ بے ہودہ کا مطلب جاننے کے لیے عذرا عباس کی شاعری کی پوری کتاب پڑھی' لیکن ہمیں گجرال اپنے شعروں کی طرح آج تک سمجھ نہیں آئے۔ پہلے خود کو شاعر کہتے تھے' پھر ان کا شعری ذوق اتنا بلند ہو گیا کہ انہوں نے خود شاعری کرنا چھوڑ دیا۔ گجرال کے گھر کا ماحول ایسا ادبی ہے کہ وہ ازدواجی مسائل بھی شعروں سے

حل کرتے ہیں۔ اسی لیے ''انڈیا ٹوڈے'' کے مطابق وہ نواز شریف اور کلنٹن سے ملاقات کے لیے جب امریکہ گئے تو ساز وسامان کے بجائے شعر وسامان ساتھ لے کر گئے۔ لیکن نواز شریف شعر سنتے نہیں، کلنٹن شعر سمجھتے نہیں۔ سو گجرال کسی کو شعر سنائے بغیر ہی واپس آ گئے۔ البتہ ان سیاست دانوں کے بجائے ان کی بیویاں شعر وشاعری کرتی رہیں۔ شیلا گجرال کئی سالوں سے مسلسل شاعرہ چلی آ رہی ہیں۔ بیگم کلثوم نواز شریف کا ادب سے اتنا تعلق ہے کہ پروفیسر سجاد باقر رضوی خود کو نواز شریف کا ٹیچر ان لا کہتے' ویسے بھی عورتوں اور سیاستدانوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سیاستدان ہاں کہے تو مراد ممکن ہوتا ہے۔ جب وہ ممکن ہے کہے تو مطلب ہوتا ہے ''نہیں'' اگر وہ نہیں کہہ دے تو وہ سیاستدان ہی نہیں۔ جبکہ ایک عورت ''نہیں'' کہتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے ممکن ہے۔ جب وہ کہتی ہے ''ممکن ہے'' تو مطلب ہوتا ہے ''ہاں'' اگر وہ ہاں کہے تو وہ عورت ہی نہیں ہے۔

تاریخ جب شاعروں کے ہاتھ آ جائے تو پھر تاریخ' ڈیٹ بن جاتی ہے۔ لیکن امریکہ میں گجرال کے شعروں کے بجائے ان کے خراٹے ہی گونجتے رہے' خراٹوں کا مغرب میں یہ فائدہ ہے کہ عورتوں کو طلاق لینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مسئلہ ہے' ایک مریض خراٹوں کے علاج کے لیے ہمارے پاس آیا اور بولا: ''ان کی وجہ سے بڑے مسئلے پیدا ہو رہے ہیں؟'' عرض کیا: ''کیا خراٹوں کی وجہ سے رات کو بیوی اٹھ جاتی ہے؟'' بولے ''میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔'' کہا ''پھر مسئلہ کیا ہے؟'' بولے ''خراٹوں کی وجہ سے تین بار مجھے نوکری سے نکالا گیا ہے۔'' گجرال کے خراٹے یہ بتانے کے لیے تھے کہ کشمیر میں امن ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک سیاح افریقی ملک کے چڑیا گھر میں گیا اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ شیر اور بکری ایک پنجرے میں ہیں۔ گائیڈ نے کہا ''یہ ہمارے ہاں پُر امن بقائے باہمی کا عملی مظاہرہ ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں ہمارے ہاں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔'' ''واقعی یہ ناقابل یقین سی بات ہے۔'' سیاح نے کہا ''میں اپنے ملک جا کر اس پر لکھوں گا۔ آپ مجھے ذرا یہ بتائیں کہ اس کامیابی کا راز کیا ہے؟'' تو گائیڈ بولا ''بس ہر روز ایک نئی بکری پنجرے میں ڈالنا پڑتی ہے۔''

انسداد دہشت گردی

کسی بھی ملک میں مجرموں کی تعداد کا اندازہ وہاں کی پولیس کی تعداد سے ہوتا ہے۔ جہاں جرائم کم ہوتے ہیں' وہاں پولیس کم ہوتی ہے یا یہ کہہ لیں جہاں پولیس کم ہے وہاں جرائم کم ہیں۔ ایک مجرم کو پکڑنے کے لیے کتنے پولیس والے چاہئیں۔ اس کا جواب تو کوئی ملزم ہی دے سکتا ہے۔ جیسے ایک ماہر نفسیات نے کسی سے پوچھا ''ایک بلب بدلنے کے لیے کتنے سائیکاٹرسٹ چاہئیں؟'' وہ بولا ''ایک ہی' بشرطیکہ بلب خود کو

بدلنا چاہیے۔ "ایسے ہی کوئی ہم سے پوچھے کہ پاکستان میں دہشت گردی کب ختم ہو گی؟ تو ہم یہی کہتے ہیں "جب دہشت گرد چاہیں گے۔" جرائم کا یہ عالم ہے کہ کل رات اچانک سڑک پر ہمارے سامنے ایک بندہ آ گیا تو ہم نے پوچھا "کیا آپ کی جیب میں ریوالور ہے یا آپ ویسے ہی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے ہیں۔" البتہ پہلے پولیس جرم ہونے کے بعد آتی تھی' اب پہلے آتی ہے۔ حکومت جرائم کم کرنے کے لیے بیک وقت دونوں قدم اٹھا رہی ہے۔ اس نے موٹر سائیکل پر ڈبل سواری بٹھانے پر پابندی لگا کر جرائم کم کر دیئے۔ وہ چاہتی تو پورے موٹر سائیکل پر پابندی لگا کر جرائم کا خاتمہ کر دیتی۔ لیکن اگر جرائم ختم ہو گئے تو تھانے کچہریوں کا کیا استعمال رہ جائے گا۔ بہت سے لوگ فارغ ہو جائیں گے۔ یہ تو پہلے ہی بیوروکریسی کی وجہ سے ہمارا وقت بچا ہوا ہے' ورنہ جو کام مہینے میں ہوتا ہے ایک دن میں ہو جاتا اور باقی 29 دن ضائع ہوتے۔ ہم نے ملک و قوم کی بہتری کے لیے پہلے بھی مشورہ دیا تھا کہ ملک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے ملک کو ڈیوٹی فری قرار دیا جائے۔ یعنی سرکاری ملازموں کو ڈیوٹی کرنے سے فری کر دیا جائے۔ ایک دن پولیس ڈیوٹی نہ کرے تو کروڑوں بچ سکتے ہیں۔ صدر صاحب ایک دن چھٹی کریں تو لاکھوں۔ دفتروں میں چھٹی کا بہت فائدہ ہو گا' کیونکہ کام تو چھٹی کے دن بھی اتنا ہی ہوتا ہے' جتنا دوسرے دنوں میں ہوتا ہے۔ بجلی' پٹرول اور رشوت کی بچت ہو گی۔ ہم حکومت کو مشورے دیتے رہتے ہیں۔ جیسے ہمیں پتہ چلا کہ حادثے اکثر ڈرائیوروں کی غلطی سے ہوتے ہیں تو ہم نے کہا کہ حادثوں کی روک تھام کے لیے ڈرائیوروں کے گاڑیاں چلانے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ ایسے ہی پتہ چلا کہ ٹرین کے حادثوں میں پہلی تین چار بوگیوں میں جانی نقصان زیادہ ہوتا ہے' تو ہم نے مشورہ دیا کہ ٹرین کی پہلی چار بوگیاں ہونا ہی نہیں چاہئیں تاکہ جانی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن اب حکومت کے فیصلوں سے لگتا ہے کہ ہم جیسے مشورے دینے والے ان کے پاس بھی ہیں۔ جن کے مشوروں پر عمل کر کے حکومت نے رات آٹھ بجے تمام دکانیں اور بازار بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ جرائم آج کل سر بازار ہونے لگے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بازار بند ہوں تاکہ سر بازار جرائم نہ ہو سکیں۔ فلاڈلفیا کے

پولیس چیف فرینک ریزور نے کہا تھا "فلاڈلفیا کی گلیاں محفوظ ہیں یہ لوگ ہیں جو انہیں غیر محفوظ بناتے ہیں۔ سو لوگوں کے کلبوں' بازاروں میں آنے پر پابندی لگا دیں' جرائم کم ہو جائیں گے۔" جرمنی کی رکن پارلیمنٹ تور رسل نے تو چوری' ڈکیتی' قتل اور دیگر جرائم روکنے کے لیے تجویز دی تھی کہ آٹھ بجے کے بعد مردوں کے سڑکوں پر نکلنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ مردوں پر پابندیاں زیادہ ہی لگتی ہیں' حالانکہ کم ہی مرد آزاد ہوتے ہیں' بیشتر شادی شدہ ہوتے ہیں۔ زار روس پیٹر دی گریٹ نے مردوں پر پابندیاں لگائیں اور حکم دیا کوئی مرد داڑھی نہیں رکھ سکتا۔ البتہ عورتوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔ بہر حال ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے جرائم کم کرنے کے لیے ٹھوس قدم اُٹھایا۔ رات آٹھ بجے تمام دکانیں اور بازار بند ہونے سے رات کے جرائم کا قلع قمع ہو جائے گا۔ حکومت کو چاہئے کہ دن کے جرائم روکنے کے لیے دن کو بھی تمام بازار اور مارکیٹیں بند رکھنے کا حکم دے تاکہ ملک مکمل طور امن کا گہوارہ بن جائے۔

مزاح کی ماں

مزاح لکھنا ایک سنجیدہ کام ہے۔ اسے صرف مزاح نگاروں پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ویسے بھی آج کل مزاحیہ تحریروں سے زیادہ سنجیدہ تحریریں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ہم نے تو لوگوں کو آئین‘ ریلوے ٹائم ٹیبل‘ مظہر الاسلام کے افسانے‘ ظفر اقبال کے شعر اور ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے پڑھ کر ہنستے دیکھا ہے۔ ویسے بھی مزاح نگار بننے کے لیے کیا چاہیے؟ ایک قلم اور چند کاغذ‘ البتہ مزاحیہ شاعر بننے کے لیے

حلیہ اور حرکات چاہئیں۔ مزاحیہ شاعر تو شاعری کا پاپ گروپ ہیں۔ احمد فراز کے بقول "ہمارے مزاحیہ شاعر بھانڈ ہیں سوائے ضمیر جعفری‘ سید محمد جعفری اور انور مسعود کے۔" ہمیں احمد فراز کے اس بیان پر حیرت نہیں ہوئی۔ لیکن اس پر ہوئی کہ کسی مزاحیہ شاعر نے اس کا بُرا نہیں منایا۔ البتہ لاہور کے بھانڈ بھا منیر نے احتجاج کیا ہے کہ یہ سب بھانڈ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہم بھانڈ تو ہر بار نئی جگت سناتے ہیں۔ فلموں کی مزاحیہ اداکاری سے ادب کی مزاحیہ کاری تک مرد چھائے ہوئے ہیں۔ خواتین کے طنز و مزاح سے تعلق کا اندازہ اس سے لگالیں کہ ان کا تو سراپا لکھا جائے تو اسے خاکہ نہیں غزل کہتے ہیں۔ شاید خواتین مزاح اس لیے نہیں لکھتیں کہ لوگ ان کی تحریروں پر ہنسیں گے۔ لیکن ڈاکٹر طاہر اسلم گورا اس کی وجہ مزاح کا غیر زنانہ صنف سخن ہونا بتاتے ہیں۔ وہ ایم بی بی ایس بھی ہیں۔ سو مزاح کے زنانہ مردانہ ہونے کے بارے میں میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی جاری کر سکتے ہیں۔ پھر وہ رائٹر بھی ہیں۔ چیک بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ویسے تو ڈاکٹر ہی ہمارے ملک کے سب سے قیمتی رائٹر ہیں۔ وہ پرچی پر دو سطریں لکھنے کے جتنے پیسے لے لیتے ہیں‘ اتنے تو بڑے ادیبوں کو پوری کتاب لکھنے کے نہیں ملتے۔ طنز و مزاح کی جنس کے بارے میں عطاء الحق قاسمی کی بھی یہی رائے ہے۔ طنز و مزاح اور جنس کے بارے میں ان سے معتبر رائے کس کی ہو سکتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ پاکستان کو اپنا دورہ کرانے تشریف لائے تو ان کی تازہ کتاب کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا گیا۔ سٹیج پر امجد اسلام امجد کو بیٹھے دیکھ کر پتہ چلا کہ عطاء الحق قاسمی صاحب کی تازہ کتاب "مزید گنجے فرشتے" کی تقریب ہے۔ اس محفل میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے فرمایا کہ عورتوں کی مزاح کی کوئی قابل قدر تخلیق نہیں۔ لاہور کی ادبی تقریبات بشریٰ رحمان صاحبہ کے بغیر ایسے ہی ہیں‘ جیسے بشریٰ رحمٰن ادبی تقریبات کے بغیر۔ ان کے ہوتے ہوئے عورت پر تنقید کرنا تو درکنار‘ آپ بلاوجہ خوشامد اور تعریف نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر اس وقت جب اس کا رخ کسی اور طرف ہو۔ محفلوں میں ان کی گفتگو قابل دید ہوتی ہے۔ وہ جو بولتی ہیں‘ وہ سرخی بن جاتا ہے اور سرخی کے بغیر وہ بولتی نہیں۔ انہوں نے فوراً عطاء الحق قاسمی

صاحب کی ''مزاح پرسی'' کرتے ہوئے کہا: ''عورت کی سب سے مزاحیہ تخلیق مرد حضرات ہیں وہ اس سے بہتر مزاح تخلیق نہیں کر سکتی۔'' یوں محفل لوٹ لی۔

بشریٰ رحمٰن کو محفلیں لوٹتے دیکھ کر اکثر شاعر شکر کرتے ہیں کہ وہ مشاعروں میں نہیں جاتیں ورنہ شاعروں اور مشاعروں کو لوٹ لیتیں۔ ان کی تصویر اور تحریر میں لڑکپن سہی لیکن سینئر ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں ان کی صدارت ہی ہوتی۔ جس سے بیشتر بزرگ شعراء کے آرام میں خلل پڑتا' کیونکہ ضمیر جعفری صاحب کی طرف بیشتر بزرگ شاعر اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان کو آرام کرنے کا موقع ہی مشاعروں میں ملتا ہے۔ جہاں ان کو سب سے آخر میں بمشکل جگا کر پڑھایا جاتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں' جو ایک مشہور شاعرہ بننے کے لیے چاہئیں۔ شعر بھی کہہ لیتی ہیں' ان کا شعری ذوق بہت بلند ہے۔ ہمیشہ ایسے معیاری شعر سناتی ہیں کہ بندہ دیکھتا رہ جائے۔ کبھی کبھی اپنے شعر بھی سناتی ہیں۔ اردو شاعری میں ان کا نام اس حوالے سے زندہ رہے گا کہ تمام مواقع ملنے کے باوجود انہوں نے اپنی شاعری کی کتاب شائع نہیں کی۔ ادب میں محترمہ کا اتنا احترام ہے کہ اکثر ادیب ان کی تحریروں کا بھی احترام ہی کرتے ہیں' کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ ہم جیسے تو بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا ناول اور عبدالعزیز خالد کا مصرع نہیں اٹھا سکتے۔ ہاں! یہ مانتے ہیں کہ ان کے ناول ادب کے بڑے ناولوں میں سے ہیں۔ ان کا جو ناول سات سو صفحوں سے کم ہو انہیں وہ خود ناول نہیں کہتیں' ناولٹ کہتی ہیں۔ ایک روسی مزاح نگار نے لکھا تھا کہ ہماری عورتوں میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ محترمہ کے ناولوں میں بھی یہ اچھی بات ہے۔ ان کے ناول ہاٹ کیک کی طرح بکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیکریوں پر دستیاب ہیں یا لوگ تول کر خریدتے ہیں۔ ناول آج کل زنانہ صنف سخن بن گیا ہے۔ عورتیں شاید ناول اس لیے زیادہ لکھتی ہیں کہ انہیں ذرا سی بات پھیلانے کا فن آتا ہے۔ خواتین کے بیشتر ناولوں میں سب سے بڑی خامی ہی یہ ہوتی ہے کہ یہ ہر کسی کو سمجھ آجاتے ہیں۔ جو تحریر عام آدمی کی سمجھ میں آجائے وہ ادبی کیسے ہو سکتی ہے؟ ادبی ناول وہ ہوتا ہے جسے کوئی صحتمند

آدمی ایک نشست میں پورا نہ پڑھ سکے' نقادوں کی بات اور ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ بشریٰ رحمٰن کے ناول بلیک ہوتے ہیں کیونکہ وہ تو رنگین ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی مانگ کا اندازہ ان کے بیک ٹائٹل کی اس تحریر سے لگالیں: ''جہاں جہاں اردو پڑھی اور بولی جاتی ہے وہاں بشریٰ رحمٰن کی شہرۂ آفاق کتابوں کی مانگ ہے۔'' یہ ان کی کسر نفسی ہے ورنہ ان کی کتابوں کی وہاں بھی بڑی مانگ ہے جہاں اردو پڑھی نہیں جاتی' صرف دیکھی جاتی ہے۔ البتہ بوائز ہوسٹلوں میں ان ناولوں کی اتنی مانگ ہے کہ مانگ کر پڑھے جاتے ہیں۔

سیاست میں ان کا احترام ادب کی وجہ سے ہے اور ادب میں نام سیاست کے باعث۔ اگرچہ یہ فیصلہ کرنا اتنا مشکل نہیں کہ کون سیاستدان ہے جتنا مشکل یہ کہ کون نہیں ہے۔ پھر جو خاتون سیاست میں آتی ہے وہ صرف خاتون نہیں ہوتی۔ محترمہ کو بھی جب پنجاب اسمبلی نے ''بلبل پاکستان'' کا خطاب دیا تو ادبی حلقوں میں بحث چھڑ گئی۔ کچھ کی رائے تھی چونکہ بلبل مذکر استعمال ہوتا ہے اس لیے یہ خطاب محترمہ کو نہیں ملنا چاہئے۔ بیشتر کی رائے تھی کہ انہیں ہی ملنا چاہئے' وہ تاحال ''بلبل پاکستان'' ہیں۔

کتاب شروع کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مزاح کی بہت سی اچھی کتابیں اسی وجہ سے نہ لکھی جا سکیں۔ اس کے باوجود یہ مزاح کا سنہری دور ہے۔ کم از کم سیاست دانوں اور بشریٰ رحمٰن کے بیانوں سے تو یہی لگتا ہے۔ اگرچہ آج کل مزاح کے جتنے نادر نمونے ہیں' ان میں سے بیشتر بڑی بڑی پوسٹوں پر فائز ہیں۔ مزاح تخلیق کرنے کے لیے سینس آف ہیومر ہونی اتنی ضروری نہیں' جتنی مزاح پڑھنے کے لیے ضروری ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں مزاح کی ماں یعنی عورت میں سینس آف ہیومر کم ہوتی ہے۔ جہاں تک مشہور خواتین کا ذکر ہے تو ان کی بات ہی اور ہے۔ ان میں اس سے زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جتنی خدا نے انہیں دی ہوتی ہیں۔ عام عورتوں کی حس مزاح کے بارے میں مسز پیٹرک کیمبل کہتی ہیں: ''آپ کو پتہ ہے خدا نے عورتوں کو سینس آف ہیومر کیوں نہیں دی؟ اس لیے کہ ہم مردوں پر ہنسنے کی بجائے ان سے پیار کر سکیں۔''

ویسے اکثر خواتین کے خاوند دیکھ کر بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ خواتین میں سینس آف ہیومر نہیں ہوتی۔ کچھ کے خیال میں خاتون کے دانت جتنے خوبصورت ہوتے ہیں' اُس میں اتنی ہی سینس آف ہیومر زیادہ ہوتی ہے۔ بہر حال عورتیں تقریباً ہر وہ کام کر سکتی ہیں' جو مرد کر سکتا ہے' سوائے سننے اور متوجہ ہونے کے۔ دنیا میں عورتوں میں زیادہ خرابیاں مردوں کی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ مرد اپنی زیادہ تر خوبیوں کے لیے عورتوں کے احسان مند ہیں۔ مردوں کے علاوہ بھی عورتوں کی مزاحیہ تخلیقات ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں خواتین مزاح نہیں لکھتیں دراصل وہ خواتین کی سنجیدہ تحریریں نہیں پڑھتے۔ کم از کم بشریٰ رحمٰن کی ہی پڑھ لیں۔

بازاری ناول اور بے زاری ناول

ہمارے نقادوں سے تو قوال ہی عقلمند ہیں جو مزاروں پر قوالیاں کرتے ہیں کہ اہل قبر اٹھ کر احتجاج تو نہیں کر سکتے۔ اگرچہ کچھ مدرس قسم کے سیانے نقاد ہیں جو صرف ان لوگوں پر لکھتے ہیں جنہیں مرے عرصہ ہو گیا ہو تاکہ ان کے بارے میں کوئی تلخ بات لکھ بھی دی جائے تو آ کر گریبان نہ پکڑ سکیں۔ زندوں کے بارے میں لکھنے سے پہلے ادبی صحت کے بجائے اصلی صحت ضروری ہے۔ لیکن انیس ناگی جیسے لوگوں کو اتنی سی

بات کی سمجھ نہیں آتی۔ خیر جو بات انیس ناگی کو سمجھ آجائے وہ اتنی سی کیسے ہو سکقارئین بھی اپنی جگہ عبداللہ حسین ہی ہیں۔ ناگی صاحب سرکاری افسر ہیں، مگر دیکھنے
ہے۔ انہوں نے پتہ نہیں عبداللہ حسین کے ناول "نادار لوگ" پر کیا لکھ دیا کہ عبداللہ انہیں اپنے ہی ماتحت لگتے ہیں۔ لیکن بولنے میں اپنے ماتحت نہیں ہیں۔ اگر وہ نہ بھی لکھتے
حسین ہر کسی سے پوچھتے پھر رہے ہیں کہ انیس ناگی کون ہے؟ ایک زمانہ تھا سیاستدان اتو اپنی گفتگو کی وجہ سے یہ مقام حاصل کر لیتے جو آج انہیں حاصل ہے۔ جو کتاب اچھی
ادیب جیل جاکر کندن ہوتے' اب جیلوں میں ڈاکوؤں اور قاتلوں کو بھی جگہ نہیں ہو ہم اسے مکمل نہیں پڑھتے اور جسے ہم مکمل پڑھ لیں وہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن
ملتی۔ سو جن وجوہ کی بنا پر پہلے جیل جاتے تھے' اب سیاستدان بیرون ملک اور ادیب بری کتاب دیکھ کر انیس ناگی کے چہرے پر وہی رونق آجاتی ہے جو مریض دیکھ کر ڈاکٹر
شاعر صحافت میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن عبداللہ حسین زیادہ تر باہر ہی رہتے ہیں۔ لوگوں کے چہرے پر آتی ہے۔ عبداللہ حسین کا نیا ناول "نادار لوگ" تو شاید ہماری طرح وہ
اور ادیبوں سے کم ملتے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کرتے رہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کبھی سرہانے رکھ کر سوتے ہوں' جس کی وجہ ناول کا تکیے کے سائز کا ہونا نہیں ہے۔
انیس ناگی نے "نادار لوگ" پر جو تبصرہ کیا ہے میں نے نہیں پڑھا بلکہ انیس ناگی کی کو کرنل محمد خاں کے بارے میں ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ جب ان کی کتاب
تحریر آج تک نہیں پڑھی۔ اگرچہ عبداللہ حسین کی صحت سے ایسا نہیں لگتا کہ انہوں بجنگ آمد" چھپی تو میرا دل ان کو مل کر مبارکباد دینے کو چاہا۔ لیکن جب تک ملاقات
نے انیس ناگی کو نہیں پڑھا۔ اگر وہ مان لیتے تو گزشتہ سال انیس ناگی صاحب کا جو ایکن کوئی صورت نکلتی تب تک ان کی "بسلامت روی" آگئی ایسے ہی "اداس نسلیں" کے
ریڈر کم ہوا تھا وہ دوبارہ مل جاتا۔ یاد رہے پچھلے سال سے ناگی صاحب اپنی کتابوں سکد عبداللہ حسین کو ملنے آنے والے اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ انہیں ناول "نادار لوگ"
پروف ریڈر بھی خود ہی ہیں۔ انیس ناگی ویسے بھی لکھتے نہیں ٹائپ کرتے ہیں۔ یوں لکھنا پڑا۔ جب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہ ناول انیس ناگی کو پسند نہیں آیا' تب سے ہم
ٹاپ کے رائٹر نہ سہی ٹائپ کے رائٹر تو ہیں۔ ہمیں انیس ناگی صاحب کی تحریریں پڑھوچ رہے ہیں کہ اس ناول میں کوئی نہ کوئی خوبی تو ہو گی۔ ورنہ انیس ناگی کسی کو بلاوجہ
کر وہ طالب علم یاد آجاتا ہے' جس نے چیخوف کے ڈرامے "دی سیگل" کو دیکھ کر ناپسند نہیں کر سکتے۔ خیر یہ ناول ان لوگوں کو بہت پسند آیا ہے' جنہیں ایسے ناول بہت
تھا: "اگر میں مر رہا ہوں اور مجھ سے پوچھا جائے کہ تمہاری آخری خواہش کیا ہے پسند آتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے انیس ناگی نے یہ ناول اچھے طریقے سے نہیں صرف
میں یہ ڈرامہ دوبارہ دیکھنا پسند کروں گا کیونکہ اگر مجھے 30 منٹ بھی زندہ رہنا ہے تو مجطریقے سے پڑھا ہے۔ ایسے ہی جیسے ہمیں شعر پڑھتے سن کر ایک بار خالد احمد نے کہا:
یہ سات گھنٹے لگیں گے۔" پہلے جب ہم ہوسٹل میں رہتے تھے تو اپنے کمرے میں شعر تو تم میرے پڑھ رہے ہو مگر اس طریقے سے پڑھ رہے ہو کہ تمہارے اپنے لگتے
فخر زمان صاحب کی کتابیں رکھتے' کیونکہ یہی وہ کتابیں تھیں جنہیں کوئی لڑکا اٹھا کر ہیں۔" ویسے "نادار لوگ" پڑھنے میں جتنی دیر لگتی ہے اتنی دیر میں ناگی صاحب خود
لے جاتا۔ جب وہ اکا۔ ڈمی ادبیات کے چیئرمین بنے تو لڑکے رات کو آتے اور ان کاول لکھ لیتے ہیں۔ یہی نہیں سنا ہے کہ لوگ اس ڈر سے ناگی صاحب کو اپنی کتابیں نہیں
کوئی نہ کوئی کتاب اٹھا کر لے جاتے۔ ہم نے ایک سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بولا: "اب یتے کہ کہیں وہ بھی انہیں اپنی کتابیں نہ دے دیں۔
رات کو کون نیند کی گولی لانے باہر جائے۔" سو ہمیں مجبوراً انیس ناگی کی کتابیں رکھ عبداللہ حسین ہمارا قومی سرمایہ ہیں ان کی کمزور صحت دیکھ کر اس کا یقین بھی
پڑیں۔ جیسے ایک شاعر نے کہا تھا: "میرا اب اپنی بیوی کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ ہو جاتا ہے بڑا رائٹر وہ ہوتا ہے جس کی وہ بھی تعریف کرے' جس نے اسے نہیں پڑھا
پوچھا "کیا وہ آپ کو سمجھتی نہیں؟" بولا "نہیں وہ مجھے سمجھ گئی ہے۔" لگتا ہے عبداللہ چھوٹا رائٹر وہ ہے' جس کی وہ ہی تعریف کرتے ہیں' جنہوں نے اسے نہیں پڑھا
حسین بھی انیس ناگی کو سمجھتے ہیں۔ اگرچہ انیس ناگی کو پڑھنے کے معاملے میں اکھوتا۔ عبداللہ حسین بڑے رائٹر ہیں اس دور میں چھ فٹ کا رائٹر اور ہے کون؟ سڈنی

اسمتھ نے کہا ہے: "مجھے جن کتابوں پر تبصرہ لکھنا ہو میں انہیں نہیں پڑھتا' بلکہ اس اگر وہ یہی کام کرتے رہتے تو آج ان کا بھی نام ہوتا۔ بڑے ادیبوں کا اصل مقابلہ اپنے
طرح آپ غیر جانبدار نہیں رہتے۔" انیس ناگی صاحب کے کتابوں پر تبصرے اس قد کے لوگوں سے نہیں ہوتا' زیادہ توانائی چھوٹوں سے خود کو بچانے میں لگتی ہے۔
لیے اچھے نہیں ہوتے کہ وہ کتاب پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو رائٹر بیٹھ بہر حال ادبی ہاتھا پائی میں ہمیں تو آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ بڑا کون ہے۔ البتہ
جاتا ہے۔ شکر ہے انہوں نے عبداللہ حسین پر زیادہ توجہ نہیں دی' ورنہ وہ تو مصنف کی عبداللہ حسین کو تو بچہ بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ بہت بڑے ہیں۔ جہاں تک ناول
تحریر سے بتا دیتے ہیں کہ اس کی بیوی سے کیسے تعلقات ہیں؟ مرزا غالب کے بارے "نادار لوگ" کی بات ہے تو یہ ان ناولوں سے بڑا ہے' جو اس سے چھوٹے ہیں۔ جاوید
میں یہ ان کا ہی انکشاف ہے کہ اس کے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ وہ شاہین صاحب کہتے ہیں کہ اس ناول میں تسلسل اور ربط نہیں تو اس میں عبداللہ حسین
محتاط نقاد ہیں اس لیے بیوی کے ساتھ اپنی بھی لکھ دیا۔ بات انیس ناگی تک ہی رہتی تو کا کیا قصور۔ بقول خامہ بگوش بیشتر ناولوں میں ربط اور تسلسل جلد ساز کی وجہ سے ہوتا
ٹھیک تھا' لیکن یہ بیس ناگی تک جا پہنچی یعنی جاوید شاہین صاحب نے بھی "نادار لوگ" ہے۔ پھر کہانی اور حقیقت میں یہ فرق تو ہے کہ کہانی اتنی بے ربط نہیں ہوتی اور یہ ناول
پڑھ لیا اور وہ بھی اس توجہ سے جیسے عبداللہ حسین نے انہیں کے بارے میں لکھا ہے۔ حقیقت سے قریب تر ہے۔ بلکہ حقیقت اس سے قریب تر ہے۔ جاوید شاہین صاحب کی
انہیں بھی ناول پسند نہیں آیا۔ کسی نے جاوید شاہین سے پوچھا' سنا ہے آپ نے "نادار تو خاموشی میں بھی لکنت پائی جاتی ہے۔ وہ اداکار بننا چاہتے تھے' ادب میں وہی مقام پایا جو
لوگ" کو بُرا ناول قرار دیا ہے۔" بولے "بالکل غلط میں نے اسے ناول قرار نہیں دیا۔" اداکار ہوتے تو پاتے۔ انیس ناگی کی طرح یہ ان کی زیادتی ہے کہ انہوں نے ناول مصنف
ویسے بھی اگر وہ ناول کو بُرا کہتے تو اس کی سیل نہ بڑھ جاتی۔ ناول ہی کیا فلم بھی بُری ہو تہی اجازت کے بغیر پڑھا اور وہ بھی توجہ سے۔ ظاہر ہے جب کوئی نقاد کسی ناول کو توجہ
زیادہ چلتی ہے۔ کہتے ہیں ماڈل اچھی ہو تو اچھا خاصا کما لیتی ہے' بُری ہو تو اور زیادہ کما لیتی سے پڑھے گا تو اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ خلاف لکھنا چاہتا ہے۔
ہے۔ یہی معاملہ ناول کا ہے۔ رضیہ بٹ' سلمیٰ کنول' بشریٰ رحمٰن اور مینا ناز کے ناول اچھا ادیب بننے کے لاکھوں طریقے ہیں۔ مگر بڑا ادیب بننے کا ایک بھی نہیں۔
فلموں کی طرح چلتے ہیں۔ ناول دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بازاری ناول اور بے زاری ناول۔ ناول شروع کرنا
عبداللہ حسین نے جاوید شاہین کو ایک خط لکھا ہے۔ جن لوگوں نے عبداللہ آسان ہوتا ہے' بس ختم کرنا مشکل ہے۔ بعض ناول بعد میں ختم ہوتے ہیں' ناول نگار
حسین کی "اداس نسلیں" پڑھی ہے وہ کہتے ہیں یہ خط عبداللہ حسین کا نہیں لگتا۔ "نادا پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ ہالی وڈ میں کوئی برا ناول لکھے تو اس پر فلم بنا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں
لوگ" پڑھنے والوں کو انہیں کا لگا ہے۔ اس خط میں انہوں نے جاوید شاہین کو تھرڈ کلاس قسم کے نقاد اسے ادبی ناول قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک جاوید شاہین کی شاعری
کلاس قسم کا شاعر کہا ہے اور توبہ کر کے اپنے بے جوہر قلم کو رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ کے بارے میں عبداللہ حسین کی رائے ہے تو اس پر جاوید شاہین صاحب کو برا نہیں
انہوں نے جاوید شاہین کو صرف ایک بار توبہ کے لیے لکھا ہے دوبار کے لیے کہنا ہوتا' منانا چاہیے' کیونکہ یہ ان کی اپنی رائے نہیں۔ وہ تو جو لوگوں سے سنتے ہیں وہی دہرا دیتے
انہیں "نادار لوگ" کا نسخہ ضرور بھجواتے۔ ہیں۔ جب "علی پور کا ایلی" اور "تلاش بہاراں" میں ادبی یدھ پڑا اور آدم جی انعام حوا
جاوید شاہین صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ مصنف اور ان کے ناول "ادار جی کو مل گیا تو جمیل الدین عالی صاحب نے کہا: "انعام دینے والے ججوں نے دونوں
نسلیں" کا نام "نیا ادارہ" میں رکھے گئے ان دنوں حنیف رامے "سویرا" کے ایڈیٹر تھے ناول نہیں پڑھے تھے۔" ہے بھی ٹھیک اگر ناول پر انعام دینا ہو تو اسے پڑھنا نہیں
اس سے لگتا ہے ان دنوں جاوید شاہین صاحب لوگوں کے نام رکھنے کا کام کرتے تھے چاہیے۔ جیسے بڑوں کی خامیوں پر نظر رکھنا بُری بات ہے' ایسے ہی بڑے ادیبوں کی

تحریروں سے صرف نظر کرنا چاہئے۔ کسی مزاح نگار نے کہا ہے: ’’کتاب بیوی کی طرح ہوتی ہے ایک نظر دیکھنے اور دور سے تعریف کرنے کے لیے بغل میں داب کر لے جانے کے لیے نہیں ہوتی اور پھر اسے پڑھنے بیٹھ جانا تو مصنف کی بے عزتی کرنا ہے۔‘‘ بہر حال اگر انیس ناگی جیسے نقاد پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کا یہی علاج ہے کہ ’’نادار لوگ‘‘ انہیں ایک بار پھر پڑھائی جائے۔

ENTER VIEW

سوال: جناب قائداعظمؒ صاحب! آپ کو ہم سے جدا ہوئے 49 سال ہو گئے۔ لیکن آج بھی پاکستانی آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جس کاغذ پر آپ کی تصویر ہو اسے سنبھال کر رکھتے ہیں بلکہ ہمارے ہاں سب سے بڑا بندہ ہی اسے مانا جاتا ہے جس کے پاس آپ کی تصویر والے کاغذ سب سے زیادہ ہوں۔ پتہ چلا ہے اب نوٹوں پر جو آپ کی تصویر ہے اس میں آپ نوٹ رکھنے والے کی طرف دیکھنے کے بجائے ایک طرف دیکھ

رہے ہیں۔ جس کی وجہ کچھ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ آج کل یہ نوٹ زیادہ تر جن لوگوں کے پاس ہیں آپ ان سے نظریں ملانا نہیں چاہتے‘ کیا یہ درست ہے؟

قائداعظمؒ: پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرلوں کہ آپ نے صبح نو بجے آنے کا کہا تھا اور آپ پورے نو بجے ہی آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ شام کے نو بجے ہیں۔ چلیں اب بھی وقت کی اتنی پابندی تو ہے کہ نو بجے سے مراد نو بجے ہی لیا جاتا ہے۔

سوال: آپ پاکستان کی گولڈن جوبلی پر بہت خوش ہیں‘ اس کی کیا وجوہ ہیں؟

قائداعظمؒ: خوشی کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارا پاکستان پچاس برس کا ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے حلیئے اور حالت سے سو سے کم کا نہیں لگتا۔ دوسری وجہ یہ کہ میں زندہ نہیں ہوں۔

سوال: اچھے لوگ جلد مر جاتے ہیں۔ یہ بات کسی نے جی ایم سید کی بیاسویں سالگرہ پر کہی تھی۔ آپ کی بے وقت موت نے پاکستانی قوم کو بے سہارا کر دیا تھا؟

قائداعظمؒ: موت بے وقت نہیں ہوتی اس کا جو وقت متعین ہوتا ہے اسی پر ہوتی ہے۔

سوال: آپ کہاں فوت ہوئے؟

قائداعظمؒ: فلم ”جناح“ میں۔

سوال: گزشتہ پچاس سالوں میں آپ کی نظر میں کون سا ایسا شعبہ ہے‘ جس میں ہم نے سب سے زیادہ ترقی کی ہو؟

قائداعظمؒ: ہم نے قرضوں میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔

سوال: سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی 13 کروڑ 52 لاکھ 80 ہزار ہے اور ہر شہری 16 ہزار 728 روپے 20 پیسے کا مقروض ہے۔ یہ قرضہ کیسے کم ہو سکتا ہے؟

قائداعظمؒ: مردم شماری سے 13 کروڑ کی آبادی 18 کروڑ ہو جائے گی اور ہر شہری پر فی کس قرض کم ہو جائے گا۔

سوال: پچاس سالوں میں سب کچھ مہنگا ہوا‘ کچھ سستا نہیں ہوا؟

قائداعظمؒ: ایسی بھی کوئی بات نہیں بہت کچھ سستا ہوا ہے مثلاً روپیہ۔

سوال: آپ کے نزدیک پچاس سالوں میں پاکستان کی سب سے قابل فخر پیداوار کون سی رہی؟

قائداعظمؒ: پاکستانی۔

سوال: اگر آپ زندہ ہوتے تو پاکستان کے یہی حالات ہوتے؟

قائداعظمؒ: پاکستان کے یہی حالات ہوتے تو میں زندہ ہوتا؟

سوال: انگریزوں نے ہانگ کانگ چھوڑا‘ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر‘ برصغیر کے معاملے میں ایسا کیوں نہ ہوا؟

قائداعظمؒ: ہانگ کانگ کے پاس کوئی نہرو نہیں تھا۔

سوال: لیاقت علی خان نے آپ کو لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے مبینہ شرمناک خطوط دیئے‘ آپ نے وہ پڑھے کیوں نہیں‘ کیا وہ اردو میں تھے؟

قائداعظمؒ: آپ کا سوال بھی ان خطوط کی طرح ہے۔ لوگ کہتے ہیں ان خطوط سے تاریخ بدل سکتی تھی۔ لیکن تاریخ چند خطوط اور بلیک میل کرنے سے نہیں بلکہ قوت ارادی اور عوام کی امنگوں سے بنائی جاتی ہے۔

سوال: ماؤنٹ بیٹن نے آپ کو متحدہ ہندوستان کا پہلا وزیراعظم بننے اور اپنی کابینہ چننے کا پورا پورا اختیار دیا‘ آپ نے قبول کیوں نہ کیا؟

قائداعظمؒ: اس لیے کہ میں متحدہ ہندوستان کا آخری مسلمان وزیراعظم نہیں بننا چاہتا تھا۔

سوال: نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن چاہتے تھے کہ آپ بھی انہیں پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنا دیں۔ آپ نے انکار کیوں کیا؟

قائداعظمؒ: ہمارے ہاں بیوی کے دو خاوند نہیں ہوتے۔

سوال: مقبول لیڈر وہ ہوتے ہیں‘ جن کے لیے عوام کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہیں‘ انہیں خود کچھ نہ کرنا پڑے‘ یہاں تک کہ مرنا بھی خود نہ پڑے؟

قائداعظمؒ: آپ موہن داس گاندھی کی بات کر رہے ہیں۔

سوال: جی، آپ کے خیال میں برصغیر کی آزادی کے لیے گاندھی جی نے کیا رول ادا کیا؟

قائداعظمؒ: فلم "گاندھی" میں ان کا رول زیادہ بہتر تھا۔

سوال: آپ میں اور گاندھی جی میں کیا فرق تھا؟

قائداعظمؒ: وہی جو اچکن اور لنگوٹی میں ہے۔

سوال: وہ لنگوٹی کیوں پہنتے تھے؟

قائداعظمؒ: اس لیے کہ اس کی جیب نہیں ہوتی۔

سوال: مغربی ممالک میں وہ بہت مقبول ہیں۔ کلنٹن کی بیٹی کے پسندیدہ ہیرو، میل گیبسن اور گاندھی ہیں کیا ایسا لیڈر وہاں پیدا نہیں ہو سکتا؟

قائداعظمؒ: مشکل ہے کیونکہ وہاں سردی بہت ہوتی ہے۔

سوال: سنا ہے آپ کبھی مسکرائے نہیں تھے؟

قائداعظمؒ: غلط ہے 15 اپریل 1947ء کو تصویر بنواتے ہوئے مسکرایا تھا۔

سوال: لوگ کہتے ہیں آپ کی کامیابی کا راز آپ کی انتہا درجے کی سنجیدگی تھی؟

قائداعظم: سنجیدگی میں یہ دیکھتے ہیں کہ بندہ سنجیدہ ہوا کس کے لیے ہے، ورنہ تو بندر بھی سر کھجا رہا ہو تو بہت ہی سنجیدہ ہوتا ہے۔

سوال: کہتے ہیں ان دنوں برطانیہ کے انگریز جب متحدہ ہندوستان کی طرف دیکھتے تو انہیں سب سے پہلے آپ نظر آتے اس لیے کہ آپ کا قد ہی بہت لمبا تھا؟

قائداعظمؒ: ہاں میرا قد ان سے لمبا تھا، جن کا قد مجھ سے چھوٹا تھا۔

سوال: سٹینلے والپورٹ کہتا ہے آپ کو گلاب کے پھول کے بجائے یک چشمی عینک زیادہ پسند تھی، وجہ؟

قائداعظمؒ: اس لیے کہ عینک لگا کر گلاب زیادہ پیارا لگتا تھا۔

سوال: آپ ہمیشہ یک چشمی عینک ہی کیوں لگاتے تھے؟

قائداعظمؒ: تاکہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھ سکوں۔

سوال: بچپن میں آپ سکول سے بھاگنے میں بھی اول آیا کرتے تھے۔ آپ کو دوسرے مسلمانوں کی طرح ریاضی کا مضمون بھی ناپسند تھا۔ بس گھوڑے دوڑانے کا شوق تھا، آپ کو کون سے گھوڑے پسند تھے؟

قائداعظمؒ: چار ٹانگوں والے۔

سوال: اداکاری سے آپ کو بہت دلچسپی تھی، آپ کو آج کل کون سا اداکار اور اداکارہ پسند ہیں؟

قائداعظمؒ: میں خبرنامہ نہیں دیکھتا۔

سوال: ایک زمانہ آپ کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ آپ کو خدا نے کیا کیا صلاحیتیں دی تھیں؟

قائداعظمؒ: مجھ میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں، جو قدرت نے مجھے دی تھیں۔

سوال: سنا ہے آپ بہت آہستہ آہستہ لکھتے تھے، کیوں؟

قائداعظمؒ: کیونکہ میری قوم زیادہ تیز نہیں پڑھ سکتی تھی۔

سوال: کالاباغ ڈیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

قائداعظمؒ: یہ سوال غفار خان سے پوچھیں۔ ویسے کالاباغ ڈیم پر جتنی مطالعاتی رپورٹیں تیار کی گئی ہیں، انہیں دریا میں پھینک دیا جائے تو خود بخود ایک ڈیم بن جائے۔

سوال: آپ کا مقولہ ہے کام کام اور کام، آپ تھکتے نہیں تھے؟

قائداعظمؒ: جب تھک جاتا تو آرام سے کام لینے لگتا۔

سوال: آپ نے ہمیشہ لاء کی پابندی کی ان لاء کی کیوں نہ کی؟

قائداعظمؒ: لاء کی وجہ سے۔

سوال: ہم سمجھتے ہیں آپ پاکستان کے طاقتور ترین حکمران تھے؟

قائداعظمؒ: میرے بعد مجھ سے بھی طاقتور حکمران آئے، میں اپنے اے ڈی سی جی جنرل گل حسن کے ساتھ گاڑی میں جا رہا تھا۔ ملیر پر ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند تھا کار روکی گئی۔ جنرل گل حسن نے دیکھا کہ ٹرین آنے میں کافی دیر ہے تو اس نے اتر کر پھاٹک

گارڈ سے کہا کہ پھاٹک کھول دو تاکہ گورنر جنرل کی گاڑی گزر سکے۔ اس نے فوراً گیٹ کھو
دیا لیکن میں نے ڈرائیور عزیز کو چلنے سے منع کر دیا اور پھاٹک بند کرا دیا کیونکہ اگر میں قانو
کی پابندی نہ کرتا تو دوسروں سے اس کی توقع کیسے رکھتا اور قانون نے مجھے اتنی طاقت نہ د
تھی کہ میں پھاٹک کھلوا سکتا۔ لیکن میرے بعد آنے والے ایسے طاقتور تھے کہ 1971
میں ذوالفقار علی بھٹو چینی سفیر کی رہائش گاہ پر کھانے کے لیے جا رہا تھا۔ جنرل گل حس
اس کے ساتھ تھا۔ بھٹو نے مغربی پاکستان میں الیکشن جیتا تھا اور یحییٰ خان نے اسے وفد ک
سربراہ کے طور پر چین روانہ کیا تھا۔ اس نے گل سے پوچھا: "تم نے جناح کے ساتھ ا
عرصہ کام کیا تمہیں ان کی کون سی بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟" گل نے اسے ملی
پھاٹک والی کہانی سنائی۔ اسی لمحے ڈرائیور نے مری روڈ پر بتی سرخ ہونے پر کار روکی تو بھ
نے ڈرائیور سے کہا "چلو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

سوال: پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے جلسوں میں آپ کو کیا فرق نظر آتا ہے؟

قائداعظمؒ: پی پی پی کے جلسوں میں سامعین اور مقررین دونوں بول رہے
ہوتے ہیں اور مسلم لیگ کے جلسوں میں دونوں سن رہے ہوتے ہیں۔

سوال: کچھ لوگ نواز شریف کو قائداعظم ثانی کہتے ہیں، آپ کے خیال میں
آپ میں اور نواز شریف میں کیا فرق ہے؟

قائداعظمؒ: وہی جو کتاب اور کچن میں ہے۔ نواز شریف علامہ اقبال کی طرح
ملک کے لیے بڑے خواب دیکھتا ہے۔ البتہ علامہ اقبال کے پاس "شاہین" تھے اس کے
پاس "شہباز" ہیں۔

سوال: کیا سکھ بھی دو قومی نظریے کے تحت الگ ملک حاصل کر سکتے ہیں؟

قائداعظمؒ: بالکل لیکن سکھوں کی تحریک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے
رہنما بھی سکھ ہیں۔

سوال: قوم کے نام کوئی پیغام دیں گے؟

قائداعظمؒ: اب قوم کو پیغاموں کا انتظار کرنے کی بجائے کام، کام اور بس کام
کرنا چاہیے۔

صدریاں

اچھا پارلیمنٹرین وہ ہوتا ہے جو ایسی اصطلاحات استعمال کرے جو کسی کی سمجھ میں
نہ آئیں اور اچھا صدر وہ ہوتا ہے جو خوبیوں کا محتاج نہ ہو۔ ویسے بھی سیاست میں خوبی نہ
ہونا بھی ایک خوبی ہے۔ لیکن ایک صدر کیسا ہونا چاہیے۔ یہ ایک وزیراعظم ہی بتا سکتا
ہے۔ سینیٹر حسین شاہ راشدی نے کہا ہے کہ صدر کوئی بیمار بوڑھا شاعر ہونا چاہیے۔
ہمارے خیال میں شاعر ہونا ہی کافی ہے۔ پھر شاعروں کو صدارتوں کا تجربہ بھی ہوتا

ہے۔ مشاعروں میں صدارت کی واحد شرط یہ ہوتی ہے کہ شاعر کی عمر خود سے کافی بڑی ہو اور وہ سوتے ہوئے خراٹے نہ لے تاکہ مشاعرہ ڈسٹرب نہ ہو۔ صدر پاکستان کے لیے بھی یہی چاہیئے کہ وہ جلد سو جایا کرے اور دوران مینڈیٹ خراٹے نہ لے۔ حافظ حسین احمد نے کہا ہے صدر ''فارغ البال'' ہونا چاہیئے۔ انہوں نے یہ شاید اس لیے کہا ہو کہ ایسا صدر جب بھی آئینہ دیکھے گا اسے فوراً قومی خزانے کا خیال آئے گا۔ ہمارے ہاں بیروزگاری اتنی ہے کہ ایک صدر کی سیٹ کیا خالی ہوئی کئی بیروزگاروں نے اس کے لیے اپلائی کر دیا، کیونکہ یہ ایسی پوسٹ ہے، جس کے لیے واحد کوالیفیکیشن 45 برس ہونا ہے۔ لیکن نواز شریف نے صدر کاسٹ کرنے کے لیے بہت سوچ بچار سے کام لیا۔ کیونکہ مس کاسٹ حکومت اور فلم کو چلنے نہیں دیتی۔ پھر نواز شریف کی تو ہر سوچ پاکستان کے حوالے سے ہوتی ہے۔ انہیں تو کوئی کہہ دے کہ میں سمارٹ ہو گیا ہوں میں نے پندرہ پونڈ کم کیے ہیں تو پوچھیں گے ''پاکستانی کرنسی میں کتنے ہوئے؟'' ہمارے ہاں کرسی اور کرنسی سیاست کی جڑ ہے۔ لیکن نواز شریف وطن کی مٹی کو نوٹوں سے قیمتی سمجھتے ہیں۔ یہ ہے بھی درست آپ ایک سال مٹی اور کرنسی کو رکھیں تو کرنسی کی قیمت کم ہو جائے گی اور مٹی کی بڑھ جائے گی۔ ہم تو آج کل خوابوں کے انتخاب میں بھی احتیاط برت رہے ہیں، کیونکہ نواز شریف نے ہمارے سارے خواب سچ کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ انہوں نے صدارت کے لیے ریٹائرڈ جسٹس رفیق تارڑ کو اپنا امیدوار نامزد کیا ہے۔ پہلے ہمارے ہاں جسٹس ہوتی تھی، آج کل جسٹس ہوتے ہیں۔ ہمیں آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ جسٹس ریٹائرڈ کیوں ہو جاتی ہے یا گرمیوں کی چھٹیوں میں ''عدل'' چھٹی پر کیوں چلا جاتا ہے۔ عبید از کانی اپنی ڈکشنری میں خوش قسمت لفظ کا مطلب یہ لکھتے ہیں: ''وہ شخص جس کو قاضی یا جج کا کبھی دیدار نصیب نہ ہو۔'' سو ہم ڈکشنری کے حساب سے خوش قسمت بندے ہیں لیکن ہمیں جسٹس رفیق تارڑ صاحب کے صدر نامزد ہونے پر اتنی حیرانی نہیں ہوتی۔ جتنی بیگم رفیق تارڑ صاحبہ کو ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے۔ صدر کیا مجھے تو ان کے جج بننے کی امید نہ تھی۔ دنیا میں اکثر بڑے آدمی بیوی کو پوچھے بغیر بڑے بن گئے۔ ان کی بیویوں کو اس کی ہرگز امید نہ تھی۔ صدر بش نے خلیج کی جنگ میں اپنی چالوں کی کامیابی کا ذکر باربرا بش سے کیا تو وہ بولی: ''میں کیسے مان لوں تمہیں ڈھنگ سے کافی بنانا تو آتی نہیں۔'' ویسے بھی کوئی مرد اپنی بیوی کا ہیرو نہیں ہوتا اور کوئی عورت اپنے ہیرو کی بیوی نہیں ہوتی۔ ایک جادوگر روز بیوی کو اپنے جادو کے کمالات دکھاتا۔ لیکن وہ اسے جادوگر ہی نہ مانتی۔ ایک دن وہ بیوی کو دکھانے کے لیے جادو کے زور پر اڑ کر اپنے گھر کے اوپر سے گزرا۔ شام کو گھر آیا تو اس کی بیوی بولی: ''تم بڑے جادوگر بنے پھرتے ہو۔ آج میں نے ایک شخص کو جادو کے زور پر آسمان پر اڑتے دیکھا اسے کہتے ہیں جادوگری!'' خاوند بولا ''گویا تم نے مجھے جادوگر مان ہی لیا کیونکہ آسمان پر اڑنے والا وہ شخص میں ہی تھا۔'' تو بیوی نے ناپسندیگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تبھی ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔'' امریکی سپریم کورٹ نے بھی خاوند کو بیوی کی ڈاک کھولنے کا حق تو دے دیا مگر حوصلہ نہ دے سکی۔ بیوی اور سپریم کورٹ میں یہ قدر مشترک ہے کہ بعد میں دونوں میں کوئی اپیل نہیں ہوتی۔ مرد آج بھی گھر کا حاکم ہے۔ بشرطیکہ وہ گھر کے سارے فیصلے اپنی بیوی کو کرنے دے۔ شوہر حاصل کرنا، مکان حاصل کرنے کی طرح ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے وہ کیسا ہے یہ دیکھتے ہیں۔ آپ کی مرمت وغیرہ سے وہ کیسا ہو جائے گا اسی لیے ہیلری کلنٹن کہتی ہے دنیا میں اتنی عورتوں نے صدر کو خاوند نہیں بنایا جتنی عورتوں نے خاوند کو صدر بنایا۔ امریکی سے بھی خاوند صدر پسند کرتے ہیں کہ ان میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے۔ روسیوں کا تو خیال ہے بیوی صدر کی طرح ہونی چاہیئے تاکہ ہر چار سال بعد بندے کو اسے تبدیل کرنے کا موقع مل سکے۔

ہمارے ہاں وزیراعظم صدر کو گھر سے ایوان اقتدار تک پہنچاتا ہے اور صدر کا کام صرف وزیراعظم کو ایوان اقتدار سے گھر تک پہنچانا ہوتا ہے۔ سو دونوں ایک دوسرے کو چن کر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں چودھری فضل الٰہی پر نظر پڑنے سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کو بیگم شاہ نواز صدارت کے لیے پسند آئیں۔ بیگم شاہ نواز میں دو صدور جتنی اہلیت تھی یعنی وہ نوے سال سے اوپر کی تھیں۔ اردشیر کاؤس جی لکھتے ہیں میں نے بیگم شاہ

نواز کے بھائی میاں اقبال شفیع کو اس بارے میں فون کیا تو انہوں نے جواب دیا: "ہا
اس قسم کی خبر اڑ رہی ہے اور میری ہمشیرہ نوے سال سے اوپر ہیں وہ صدر کے عہد
پر فائز ہونے کی پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ ان کی بصارت کمزور ہو چکی ہے۔ ٹھیک
دیکھ نہیں پاتیں۔ اس کے علاوہ ان کی قوت سماعت بھی ختم ہو چکی ہے۔ وہ بڑی مشک
سے بات کرتی ہیں اور بغیر سہارے چل نہیں سکتی۔ ہم توقع کر رہے ہیں انہیں نظ
انداز نہیں کیا جائے گا۔" چند دنوں بعد مجھے اقبال شفیع نے پھر فون کیا اور کہا "ایک بر
خبر سن لو جہاں آرا شاہ نواز کا صدر بننے کا امکان کم ہو گیا ہے۔ ان کے ایک کان م
سماعت واپس آ گئی ہے۔ ان کی بینائی بھی بہتر ہو گئی ہے اور انہوں نے اپنی نرس کو دہ
دے کر پرے پھینک دیا ہے۔ اب وہ صدر بننے کی صلاحیتوں سے محروم ہو گئی ہیں۔
شاید انہیں صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کان سے آ
سماعت نکال کر صدارت کے لیے اپنی کمپیئن اور سائیکل چلا رہے ہیں۔ ان کے خیا
میں ان صلاحیتوں کے علاوہ صدر بننے کے لیے بس صدریاں چاہئیں جو ان کے پا
پہلے ہی تین ہیں۔ انہیں کسی نے کہا "نواز شریف کو درد دل رکھنے والا صدر چاہیے۔"
وہ بولے "مجھے بھی دل کا درد رہتا ہے۔ ثبوت کے لیے وہ ای سی جی دکھانے کو تیا
تھے۔" کہتے ہیں "میں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا لیتا ہوں۔ صدارت چلانا میرے لیے
چنداں مشکل نہ ہو گا۔" خدا نے ہر بندے کے حصے کے بے وقوف پیدا کیے ہیں۔ اصل
مسئلہ اپنے حصے کے بے وقوف ڈھونڈنا ہے۔ ایسے ہی خدا نے ہر وزیراعظم کے حصے کے
صدر بنائے ہوئے ہیں۔ بس انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ سنا ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰ
لاہوری آج کل اپنا نام ترجمے کے ساتھ ڈاکٹر فضل الٰہی ہی بتاتے ہیں۔ ویسے چودھر
فضل الٰہی بننے کے لیے چودھری ہونا ضروری نہیں۔ وزیراعظم پر فضل الٰہی ہو
چاہئے جہاں تک ہمیں علم ہے۔ رفیق تارڑ صاحب میں "اچھے" صدر والی کوئی خوب
نہیں وہ دور تک سوچتے ہی نہیں دور تک سنتے اور دیکھتے بھی ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی
بیگم صاحبہ نے کہا ہے "حیران ہوں کہ نواز شریف نے انہیں کس بنا پر چن لیا۔"

ہودہ بے ہودہ

سیاست دانوں کے پاس جب کہنے کو کچھ نہ ہو تب وہ انٹرویو دینے لگتے ہیں۔ ویسے بھی بڑا سیاست دان وہ ہوتا ہے جو کسی بڑے سے بڑے مسئلے پر اس کے حق میں یا مخالفت میں ایک لفظ کہے بغیر گھنٹوں تقریر کر سکے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی "ایسے ویسے" لیڈر ہی ہیں وہ مقبوضہ کشمیر کے مسائل پر یوں روشنی بلکہ روشنائی ڈالتے ہیں کہ مسئلہ غائب ہو جاتا ہے۔ ایک زمانے میں امریکہ کے ڈاکٹر دل کی بیماریوں کی جو وجوہات

بتاتے ان میں سگریٹ نوشی، ٹینشن اور مارلن منرو شامل ہوتی، ایسے ہی مقبوضہ کشمیر
کے حالیہ مسائل میں سے ایک کا نام ڈاکٹر فاروق عبداللہ ہے۔ ڈاکٹر تین قسم کے ہوتے
ہیں۔ پہلے وہ جو دوسروں کا علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کا پہلے علاج کرتے ہیں
اور تیسرے لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ کسی کی رائے ہے لیڈی ڈاکٹر آدھی لیڈی ہوتی ہے اور
آدھا ڈاکٹر۔ بہرحال ڈاکٹر فاروق عبداللہ کون سے ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں
بڑے پڑھے لکھے ہیں۔ مگر اپنی گفتگو سے کسی کو اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ بچے اکثر ماں
باپ کی صحبت میں رہ کر بگڑ جاتے ہیں۔ فاروق عبداللہ نے تو شیخ عبداللہ کی صحبت میں
بچپن گزارا۔ مقبوضہ کشمیر میں اتنی سردی ہوتی ہے کہ آگ تاپنے کے لیے سید عبداللہ
نے "چناروں کی آگ" بلکہ "چناروں کو آگ" لگائی۔ 1997ء میں تو ہمارے ہاں بھی
اتنی سردی پڑی کہ درجہ حرارت اور بینظیر کے سوئس اکاؤنٹس نقطۂ انجماد تک پہنچ گئے۔
کہتے ہیں "جنگ میں سب سے پہلا زخمی سچ ہوتا ہے۔" اسی لیے مقبوضہ کشمیر کی جنگ
آزادی سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے تازہ انٹرویو میں
کہا ہے کہ یہاں سب امن ہے۔ ٹی وی پر موصوف کو معمول کے کام کرتے یعنی
ملازموں کو ڈانٹتے، غصہ کھاتے اور عورتوں کی باتیں کرتے دکھایا گیا۔ ان کے انٹرویو
سے پتہ چلا کہ پورے مقبوضہ کشمیر کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مادھوری ڈکشٹ سے
ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی ملاقات نہیں ہو رہی۔

سیاست کاری اور اداکاری کا بڑا قریبی تعلق ہے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے
اسے قریب ترین تعلق بنا دیا۔ کشمیر میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جس مقام پر ان کا
گھر ہے جبکہ کشمیر سے تعلق اس فلمی اداکارہ جیسا ہے جو ایک پارک میں شوٹنگ
کر رہی تھی کہ ڈائریکٹر کی نظر ایک بچے پر پڑی جو پارک میں کھیل رہا تھا۔ اس نے
"کتنا پیارا بچہ ہے؟" اداکارہ نے کہا "یہ تو میرا بچہ ہے۔" اداکارہ کی سہیلی بولی
"تمہیں یقین ہے یہ تمہارا بچہ ہے۔" اداکارہ بولی "کیوں نہیں میں اپنے بچے کی آیا کو
پہچانتی ہوں۔" ویسے ہماری اداکارائیں بھی اپنے بچوں کو کم ہی پہچانتی ہیں۔ اکثر
انہیں اپنا بھائی یا بہن کہہ کر بلاتی ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی زندگی کرسی، کرنسی اور کڑی کے گرد گھومتی ہے۔
خواتین کے لیے وہ اپریل اور کشمیریوں کے لیے دسمبر ہیں۔ شہنشاہ بابر نے کہا تھا:
"میں نے اپنی زندگی میں صرف اڑھائی کام کیے ہیں۔ ایک بار فرغانہ سے بھاگ کر
ہندوستان آرہا تھا تو راستے میں اژدھے سے خود کو بچایا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ ایک بار
دربار میں چین کا وفد آیا ہوا تھا۔ ملاقات کے دوران میرے جسم پر خارش ہونے
لگی۔ میں نے وفد کی موجودگی میں کھجانا مناسب نہ سمجھا۔ خارش روکنے کے لیے
میں نے اتنا زور لگایا کہ مجھے پسینہ آگیا۔ میں نے جو اہم ترین کام کیے وہ یہی دو تھے۔
آدھا کام یہ کہ میں نے ہندوستان پر حکومت کی۔" ڈاکٹر عبداللہ نے بھی ڈیڑھ کام
کیا۔ ایک تو شبانہ اعظمی کو سائیکل پر بٹھا کر شبانہ وار کشمیر کی چڑھائیاں چڑھنا اور باقی
آدھا کام ریکھا کی ریکھاؤں کو دیکھنا ہم یہ نہیں کہتے یہ کوئی کام ہی نہیں جیسے وسیم
اکرم جب بھارت سے میچ ہارا تو لوگوں نے بڑی لعن طعن کی تو موصوف کہنے لگے
"لوگ تو صرف ہماری ہار پر نظر رکھتے ہیں بھارت سے ہم جیتے بھی تو ہیں۔" پوچھا
"کیا جیتے ہیں؟" بولے "ٹاس۔"

ڈاکٹر فاروق عبداللہ مقبوضہ کشمیر کے ہیرو تو نہ بن سکے۔ اسی لیے اب وہ
مادھوری کے ہیرو بننا چاہتے ہیں۔ اگرچہ طبیعت ایسی ہیروانہ پائی کہ نکاح نامے پر
بھی دستخط یوں کیے تھے، جیسے آٹوگراف دے رہے ہوں۔ مادھوری اور فاروق
عبداللہ میں یہی قدر مشترک ہے کہ فل سائز شرٹ بھی دونوں پر موزے کی
طرح فٹ آتی ہے۔ موصوف تو خود کو ڈسکو وزیراعلیٰ کہتے ہیں۔ واقعی وہ ڈسکو کے
وزیراعلیٰ لگتے ہیں۔ ان کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیارات یہ ہیں کہ شبانہ اعظمی
ریکھا یا مادھوری کو سائیکل پر گھما سکیں۔ باقی سب بھارت کے پاس ہے۔ کہا یہ جاتا
ہے کہ اختیارات میں کشمیریوں کا بھی حصہ ہے۔ ہمارے خیال میں اختیارات کا
آدھا حصہ بھارت کے پاس اور آدھا کشمیریوں کے پاس ہے یعنی "اختیارات" کی
"اختیا" بھارت کے پاس اور باقی حصہ "رات" کشمیریوں کے لیے ہے۔ ہندو تو وہ
شخص ہے جسے ایک مسلمان نے کہا "آپ کو یاد ہے آپ نے میرے پچاس روپے

دیتے ہیں۔" تو وہ بولا "ہاں ہاں یاد ہے اور مرتے دم تک یاد رہے گا۔" مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے ہندو کو بات "واضح" طریقے سے سمجھانا ہے۔ جیسے ایک فیکٹری میں کام کرنے والے نے انشورنس پالیسی پر سائن کرنے سے انکار کر دیا۔ فورمین نے اسے سمجھایا۔ منیجر نے بات کی سپرنٹنڈنٹ نے افادیت بتائی مگر وہ نہ مانا تو پھر فیکٹری کا مالک اسے ایک طرف لے گیا اور کہا "سنو! اگر تم نے سائن نہ کیے تو کان سے پکڑ کر فیکٹری سے نکال دوں گا۔" ملازم نے فوراً دستخط کر دیے، بعد میں مالک نے پوچھا "اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم نے پہلے اس پر دستخط کیوں نہیں کیے تھے؟" ملازم بولا "کسی نے اتنے واضح طریقے سے پالیسی سمجھائی ہی نہ تھی۔"

ناغہ بلاناغہ

اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاست دان کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں تک قوم کی خدمت بھی۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ بس ایک ہی کام کرتے ں۔ وہ ہے اقتدار کو طویل کرنا۔ ہمارے ہاں جلد ہی حزب اختلاف زبان درازی حزب اقتدار حکومت درازی پر اتر آتی ہے۔ وزیر اعظم نواز شریف جو پہلے ریروں میں پانچ پانچ بار یہ کہتے کہ مجھے دو سال دے دیں اب ایک بار ہی دس

سال کہنے لگے ہیں۔ شہباز شریف صاحب بھائی کے دس سالوں میں اپنے د
سال ملا کر حکومت کے لیے بیس سال مانگنے لگے ہیں۔ ہمارے محترم عبدالقا
حسن صاحب انہیں بیس کے بجائے پچیس سال دے بھی دیتے ہیں۔ حا
شیرازی نے جب اپنے محبوب کے ایک تل کے بدلے سمرقند و بخارا دیئے
بات کی تو کہتے ہیں امیر تیمور نے طیش میں آکر کہا ''ہم نے بڑی مشکلوں اور قت
غارت کے بعد یہ شہر فتح کیے۔ آپ اپنی حالت دیکھیں اور چلے ہیں محبوب
ایک تل کے بدلے سمرقند و بخارا دینے۔'' تو حافظ شیرازی نے کہا ''انہی
خرچیوں نے تو یہ حالت کی ہے۔'' بہرحال عبدالقادر حسن صاحب نے ان پچ
سالوں کی ترکیب استعمال بھی ساتھ دی ہے۔ سچی بات ہے ہر سیانے بندے
حکومت کرنے کا بہترین طریقہ آتا ہے۔ اس وقت تک جب تک وہ حکومت
شامل نہیں ہو جاتا۔ ہمارے ایک دانشور کہا کرتے تھے ''مجھے بچے پالنے کے
اصول آتے تھے۔ اب میرے تیرہ بچے ہیں اور ایک اصول کا بھی پتہ نہیں۔
جیسے ابراہیم لنکن نے کہا تھا ''بلونگڑے دیکھ کر لگتا ہے کہ بلیاں صرف لڑتی
نہیں رہتیں'' ایسے ہی موٹروے دیکھ کر لگتا ہے کہ نواز شریف صرف حکومت
نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے کہ حکومت مہنگائی پر قابو پائے مہن
حکومت پر قابو پا لیتی ہے۔ لیکن نواز شریف نے روپے کے علاوہ اگر اور کچھ
کیا تو وہ شادیاں ہی ہیں' پھر بھی پچھلے سال اتنی کم شادیاں ہوئیں کہ اس سال
مصطفی کھر نے بھی شادی نہیں کی۔

کہتے ہیں حکومت کو جلدی آہستہ آہستہ کرنی چاہئے۔ لیکن نواز شر
جلدی کرنے میں بڑی جلدی کرتے ہیں۔ کمیونزم دور میں روس میں گوشت
قلت ہوئی تو کسی نے کمیونسٹ پارٹی کے چیف سے اس کی وجہ پوچھی وہ بولا''
کمیونزم کی راہ پر اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ مویشی اس تیز رفتاری
ہمارا ساتھ نہیں دے پائے اور پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسی لیے گوشت کی ق
ہو گئی۔'' نواز شریف بھی عوام کو اتنی تیزی سے ترقی کی موٹروے پر دوڑا ر

ہیں کہ روزمرہ کی ضرورت کی اشیاء بھی پیچھے رہتی جا رہی ہیں۔ ہم مانتے ہیں
حکومت نے دس ماہ میں پانچ سال جتنا کام کیا یعنی اتنی غلطیاں کیں جتنی پانچ سال
میں ہوتی ہیں ایسے ہی تیز رفتار ویگن ڈرائیور کو اس کی ماں نے کہا تھا ''بیٹا اپنی
رفتار میری دعاؤں سے تیز نہ رکھنا۔'' نواز شریف جتنی تیزی سے کام کرنا چاہتے
ہیں بیوروکریسی نہ ہوتی تو اس میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا یعنی جو کام
بیوروکریسی کی وجہ سے تیس دن میں ہوتا ہے' دو دن میں ہو جاتا باقی 28 دن
ضائع ہوتے۔

نواز شریف اب پہلے والے نہیں رہے۔ ان کے زمانہ طالب علمی کے ایک
ساتھی نے بتایا کہ پہلے وہ چھٹی کے نام سے بھی خوش ہو جایا کرتے تھے۔ اب اس کا
نام سن کر ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ مشکل کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے
کہ یہ بڑی آسانی سے شروع ہو جاتی ہے۔ نواز شریف مشکلوں کا سر توڑ مقابلہ نہیں
کرتے۔ سر جوڑ مقابلہ کرتے ہیں وہ سنتے سب کی ہیں' مگر کرتے وہی ہیں جو ان کو
سوٹ کرے۔ ان جیسا ایک شخص علاج کے لیے بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔
ڈاکٹر نے بیوی دیکھ کر کہا: ''یہ ایک مہینہ کام کاج نہ کریں اور تبدیلی آب و ہوا کے
لیے انہیں کشمیر یا زیارت لے جائیں۔'' شوہر خاموش رہا تو بیوی نے کہا ''بتاؤ کہ ہم
کہاں جائیں گے؟'' شوہر بولا ''کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس۔'' اس کے باوجود جب
سے نواز شریف نے دور حکومت لمبا کرنے کی خواہش کی ہے ہر کوئی درازی کا نسخہ
میاں صاحب کو بتا رہا ہے۔ حالانکہ اس کا آسان حل تو یہ ہے کہ اسمبلی سے یہ بل
پاس کروا لیا جائے کہ آئندہ ہر سال کے 730 دن ہوں گے۔ ایک ستارہ شناس
انتظار حسین زنجانی نے تو انہیں یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ اقتدار کو طول دینا چاہتے
ہیں تو منگل کو گوشت کا ناغہ ختم کر دیں۔

صاحب! بلاناغہ حکومت کے لیے ناغہ تو ہونا ہی نہیں چاہئے۔ اگرچہ انتظار
حسین زنجانی صاحب کا مشورہ ایسا ہے کہ لگتا ہے وہ ضرور حکومتی مشیر رہے ہیں'
ورنہ کوئی سمجھدار بندہ ایسی بات کیونکر کر سکتا ہے۔ ایک مزاح نگار نے لکھا تھا کہ

میری بیوی اکثر مجھے صحیح فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ جو مشورے دیتی ہے میں اس کے الٹ کر کے کامیاب ہو جاتا ہوں۔ ایسے ہی نواز شریف کے مشیر بھی انہیں صحیح فیصلے کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اب بھی وہ ان کے مشوروں پر عمل کر کے حکومت دراز کر سکتے ہیں۔ ایک سیاست دان مہلک مرض میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ آپ ایک سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ اس نے ڈاکٹر سے سارے ٹیسٹ دوبارہ کر کے تشخیص پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ لیکن ڈاکٹر نے پھر بھی یہی کہا کہ میں آپ کو ایک برس سے زیادہ زندہ رہنے کی نوید نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنے مشیروں کو طلب کیا اور عمر دراز کرنے کے لیے سوال دراز کیا۔ مشیروں نے اس کا جو حل ڈھونڈا وہ یہ تھا کہ ایسے ہی چار اور ڈاکٹروں کو کنسلٹ کیا جائے اگر ہر کوئی ایک ایک سال زندہ رہنے کی امید دلاتا ہے تو یہ ملا کر پانچ سال تو بن ہی جائیں گے۔

ہم جانوروں کے بارے میں اتنا ہی علم رکھتے ہیں۔ کہ صرف انسان کو جنت سے نکالا گیا۔ ان کا گوشت حکومت درازی کے لیے کتنا مقوی ہے۔ یہ معلوم نہیں البتہ نواز شریف جانوروں کے بارے میں بہت جانتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ پکے ہوئے ہوں۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے منگل کو گوشت کا ناغہ ختم ہونے سے منگل کے روز بھی سری پائے ملیں گے اور بڑے پائے کھا کر ہمارے لیڈر بڑے پائے کے لیڈر بن جائیں گے۔ یوں ان کی اور حکومت کی صحت بہتر ہو گی لیکن ممکن ہے زنجانی صاحب یہ کہنا چاہ رہے ہوں کہ حکومت کو لمبی چھوٹی کرنا قصائیوں کا کام ہے۔ سو منگل کا ناغہ ختم کر کے انہیں منافع کمانے اور کھانے میں مصروف کر دیا جائے تاکہ ان کے پاس حکومت ختم کرنے کا سوچنے کے لیے وقت ہی نہ بچے اور حکومت عوام کے مسائل کی طرح طویل ہوتی جائے یہی نہیں ناغے کی وجہ سے جو کالی بھیڑیں بچ جایا کرتی تھیں، وہ بھی نہیں بچیں گی۔

مِرجا گالِب

منیر نیازی صاحب بادشاہ آدمی ہیں، حالانکہ بندہ ایک بار بادشاہ ہو جائے تو اسے دوبارہ آدمی ہونے میں مدتیں لگ جاتی ہیں۔ آج کل وہ زیادہ تر شاعری کرتے ہیں۔ البتہ جب کوئی اہم بات کہنا ہو تو انٹرویو دے دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ان کے انٹرویوز ان کی شاعری کی طرح لاجواب ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں ان کی شاعری ان کے انٹرویوز کی طرح لاجواب ہے۔ وہ خود اپنا انٹرویو پڑھ کر پتہ لگاتے ہیں کہ وہ آج

کل کیا سوچ رہے ہیں؟ اپنے تازہ انٹرویو میں انہوں نے فرمایا کہ فیض احمد فیض کے پاس کوئی فکر نہ تھی۔ اگر فیض صاحب زندہ ہوتے تو یہ پڑھ کر ہی انہیں فکر لگ جاتی۔ بہر حال ہم جیسے فیض کو پسند کرنے والوں کو اس بیان نے نئی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں بڑی فکر سے بڑا شاعر بنتا ہے۔ شاید اسی لیے ہم جسے بڑی فکر میں مبتلا دیکھتے ہیں' اسے شاعر سمجھ لیتے ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی شاعر اچھی حالت میں نظر آجائے تو لوگ سمجھتے ہیں اس نے شاعری چھوڑ کر کالم نگاری شروع کر دی ہوگی۔ ہمارے مشہور شاعر خالد احمد صاحب تو جس دن نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر گلی میں آجائیں' بچے اپنی ماؤں سے جاکر عیدی مانگنے لگتے ہیں۔ اس حساب سے فیض احمد فیض ہمیں بے فکرے ہی لگے۔ جہاں تک فکر کی بات ہے۔ اس کی ہمیں فکر نہیں البتہ منیر نیازی صاحب فیض احمد فیض سے بڑے قد کے شاعر ہیں۔ اگرچہ ان کا قد کنہیا لال کپور جتنا بھی نہیں ہے۔ جن کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کا بخار اترنے میں آٹھ گھنٹے لگیں گے۔ گھر والوں نے پوچھا "اتنی دیر؟" ڈاکٹر بولا "آپ ان کا قد بھی دیکھیں' بخار کو اترنے میں وقت تو لگے گا۔"

آج کل مقبول شاعر پیدا ہونا پہلے سے کہیں آسان ہے۔ کیونکہ لوگ پڑھتے بہت کم ہیں' سو جب تک یہ پتہ چلتا ہے فلاں برا لکھتا ہے تب تک اسے پرائیڈ آف پرفارمنس مل چکا ہوتا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا بڑے درخت کے نیچے چھوٹا درخت نہیں اُگ سکتا۔ اب کہا جانے لگا ہے کہ چھوٹے درخت کے نیچے بھی بڑا درخت نہیں اُگ سکتا۔ سر بڑھ جائیں تو دماغ کم ہو جاتے ہیں۔ شاعر بڑھ جائیں تو شاعری گھٹنے لگتی ہے۔ لکھنے والے اپنی کتابیں اسی مقصد کے لیے چھپواتے ہیں' جس مقصد کے لیے پہلے وزیٹنگ کارڈ چھپواتے تھے۔ بہت سے شاعر ایسے ہیں' پہلے معاشرے میں ان کا بڑا مقام تھا۔ لیکن پھر وہ شاعری کرنے لگے۔ خود فیض احمد فیض بتاتے ہیں کہ ایک مشاعرے کے منتظمین نے ہمیں کسی انجینئر کے ہاں ٹھہرایا۔ مشاعرہ ختم ہوا اور ہم اپنے میزبان کے ہاں پہنچے۔ ہمارے ساتھ چند شعراء کرام بھی تھے۔ ان میں پروفیسر شور بھی تھے۔ صاحب خانہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ہم سب ان کے صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں

بیٹھ گئے۔ اتنے میں انجینئر صاحب تشریف لائے۔ پروفیسر نے ہمارا تعارف کرایا "یہ فیض ہیں۔" انجینئر صاحب نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ صرف مصافحہ کرتے ہوئے "ہوں" پر ہی اکتفا کیا۔ بیچارے شور صاحب پریشان ہوئے۔ انہوں نے تقریباً شور مچاتے ہوئے کہا "بھئی یہ مسٹر فیض احمد فیض' بڑے شاعر ہیں۔" انجینئر صاحب نے اب دو مرتبہ "ہوں' ہوں" کیا۔ شور صاحب بلبلا اٹھے۔ کہنے لگے "بھئی فیض احمد فیض بہت بڑے آدمی ہیں' یہ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔" وہ چونک کر بولے "مگر وہ تو انگریزی کا اخبار ہے۔" ہم نے کہا "جی ہاں" پھر بولے "مگر آپ مشاعرے میں تشریف لائے ہیں۔" عرض کیا "جی ہاں" بولے "آپ اردو میں شعر کہہ لیتے ہیں۔" ہم نے کہا "جی ہاں۔" شور صاحب دھڑام سے کرسی میں گرے اور خاموش ہوگئے۔ انجینئر صاحب کہنے لگے "فیض صاحب آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں' پاکستان ٹائمز کہاں اور یہ شعر اور مشاعرہ کہاں' آپ کیوں وقت برباد کرتے ہیں' جائیں اخبار کو ٹھیک طریقے سے چلائیں۔"

کنہیا لال کپور کے بقول لارڈ بائرن نے ایک صبح آنکھ کھولی اور خود کو مشہور پایا' اس کے برعکس فیض صاحب نے ایک شام آنکھ کھولی اور خود کو مقبول پایا۔ اب ہمارے شاعروں کی شام کو آنکھیں کھلتی ہی نہیں۔ ایک ایسے ہی شاعر نے ایک بار منیر نیازی سے پوچھا "آپ کے خیال میں آج کل کتنے شاعر اچھی غزل لکھ رہے ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا "تمہارے اندازے سے ایک کم۔" ہمارے ہاں مقبول شاعروں کے اٹھ جانے سے ادب میں جو خلا پیدا ہوتا ہے' وہ تو خود داد صلاحیتوں سے پُر ہو جاتا ہے۔ مگر مشاعروں میں جو خلا پیدا ہوتا ہے' وہ مدتوں پورا نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ صاحب صدر کا متبادل ڈھونڈنا کوئی آسان نہیں۔ لاہور میں ذہنی معذوروں کے ایک ادارے میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ محمد عارف نکئی کو صدارت کرنا تھی۔ وہ نہ آسکے تو منتظمین کو متبادل صدر کی تلاش میں بڑی دشواری ہوئی۔ آخر ایک ذہنی معذور بچے سے اس تقریب کی صدارت کروانا پڑی۔ فیض صاحب نے بتایا "بنگال میں اب بھی اکثر شعراء جب اپنا کلام سنانے جاتے ہیں تو بغل میں ہارمونیم داب کر لے جاتے ہیں اور باری آنے پر

با قاعدہ ترنم کے ساتھ ہارمونیم کی سنگت میں کلام سناتے ہیں۔" اگرچہ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کو پتہ نہیں چلتا کہ کلام زیادہ برا تھا یا ترنم۔ منیر نیازی صاحب ایسا کچھ ساتھ تو نہیں لے جاتے لیکن مشاعروں میں کلام سناتے وقت ساتھ بیٹھے شاعروں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے گاتے ہوئے غلام علی اپنے سازندوں کو دیکھتے ہیں۔ منیر نیازی صاحب اکثر شاعروں' ادیبوں کی موجودگی پر بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں' جس کی وجہ اکادمی ادبیات کے چیئرمین نذیر ناجی صاحب نے وہی بتائی ہے' جس وجہ کا حل کامیڈین عابد خان کو ایک سیانے نے بتایا تھا۔ اس نے عابد خاں سے کہا" خاں صاحب آپ کی ناک ہر وقت اوپر چڑھی رہتی ہے۔ میرے پاس اسے نارمل کرنے کا نسخہ ہے۔" عابد خاں نے پوچھا" کیا نسخہ ہے؟" تو وہ بولا" آپ جرابیں دھو کر پہنا کریں۔" بقول نذیر ناجی یہی نسخہ قتیل شفائی منیر نیازی پر آزماتے رہے۔ اسی لیے شاعر منیر نیازی کے جوتوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا ان کی جرابوں سے ڈرتے ہیں۔

فیض احمد فیض صاحب ایسے شخص تھے کہ وہ تو کسی کے جنازے میں بھی جا رہے ہوتے تو اس کی درازی عمر کی دعائیں مانگتے جاتے۔ جہاں تک منیر نیازی صاحب کے اس بیان کا تعلق ہے کہ فیض کے ہاں کوئی فکر نہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ انہوں نے فیض احمد فیض کے خط نہیں پڑھے۔ 18 اگست 1951ء کو جیل سے انہوں نے اپنی بیگم ایلس فیض کو جو خط لکھا' اس میں ان کی فکر ملاحظہ فرمائیں" یہ بات یقیناً پریشانی کی ہے کہ ہم گنجے ہوتے جا رہے ہیں چونکہ گرد زیادہ ہے اور میرے بالوں کی حالت جو عام طور پر خراب رہتے ہیں' بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس وقت تک جب تک میں جیل سے باہر نکلوں گا اپنی جنسی کشش کھو چکا ہوں گا۔" فیض صاحب فارغ وقت میں سرفراز اقبال اور علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے۔ ان کی 52 فیصد فکریں خواتین کی وجہ سے تھیں' جس کی وجہ یہ تھی کہ خواتین کل آبادی کا 52 فیصد ہی تھیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں ایک بار کہنے لگے ہم دہلی میں آئی سی ایس کا امتحان دینے گئے۔ پرچے عمدہ ہو رہے تھے۔ آخری پرچہ دینے نہ گئے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے وجہ پوچھی تو ساتھ بیٹھی بیگم فیض بولیں "It must be a girl" انہیں محبت کی فکر رہتی کیونکہ

بقول شخصے محبت کوئی مستقل چیز نہیں نہ یہ کوئی پتھر ہے جو مستقل رہتا ہے۔ محبت روٹی کی طرح ہوتی ہے ہر روز تازہ روٹی چاہئے ہوتی ہے۔ جہاں تک فیض احمد فیض اور منیر نیازی کے مقام کی بات ہے تو ہمارے لیے یہ دونوں اس سیٹھ کی طرح عظیم ہیں' جس کی فیض احمد فیض سے جم خانہ کلب کراچی میں ملاقات ہوئی۔ اس کے ایک دوست نے کہا" سیٹھ صاحب! آیئے آپ کی ملاقات پاکستان' ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر سے کرائیں۔" سیٹھ صاحب نے فیض احمد فیض سے مصافحہ کیا اور بولے" ہاں بھئی ہم جانتا ہے یہ مرجا گالب ہے۔"

امریکہ اِن لاء

یہاں ان لاء سے مراد وہ نہیں‘ جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ ہم نے ایک بار لکھ دیا کہ مصطفیٰ کھر کئی سالوں سے پریشان ہیں تو انہوں نے غصے سے وضاحت کی کہ میں اپنے سالوں سے ہرگز پریشان نہیں۔ سو ہم پہلے ہی واضح کر دیں کہ یہاں امریکہ کے قانون کا ذکر مقصود ہے۔ اگرچہ آبادی کے حساب سے پاکستان میں دنیا میں سب سے زیادہ وکیل ہیں اور ان کا مقام بھی بہت ہے۔ ایک جج نے ملزم سے کہا حلف اٹھاؤ کہ جو

کچھ کہوں گا سچ کہوں گا‘ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔" ملزم بولا "بالکل ٹھیک کیونکہ میں نے وکیل کیا ہوا ہے۔" اس کے باوجود ہمارے ہاں بڑی دعا یہ ہے کہ خدا تجھے کبھی تھانہ کچہری نہ دکھائے۔ لیکن امریکہ میں تو بیوی خاوند کو پیالی مار دے تو وہ پٹی کرانے ڈاکٹر کے پاس بعد میں جائے گا‘ وکیل سے مشورہ پہلے کرے گا۔ ان کے باسکٹ بال سٹار ڈینس راڈمین نے جب کہا کہ میں نے ابھی اپنی جنس کا تعین نہیں کیا۔ اپنے وکیل سے مشورہ کر کے کچھ بتا سکوں گا‘ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ وہاں وکیلوں کا کیا مقام ہے۔ اب سیتاوائٹ کیس کے بعد پتہ چلا کہ یہ فیصلہ بھی عدالت کرے گی کہ ٹیرن کا باپ کون ہے؟

امریکی بچوں کے بارے میں جاننے کے لیے یہی کافی ہے کہ پچھلے سال 134 امریکیوں نے اپنے بچوں کا نام زلزلہ رکھا۔ وہاں کام کرنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کام خود اٹھ کر کر لو‘ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ملازم سے کہہ کر کروا لو اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے بچے سے کہو وہ یہ کام نہ کرے۔ بچوں کی والدین سے نہ بننے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہم عمر نہیں ہوتے۔ دوسری وجہ وہاں کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ پچاس فیصد امریکی اپنے بچوں کے اصلی باپ نہیں ہیں۔ وہاں ایک بچہ تھانے آیا اور کہا "میرا والد ایک شخص کے ساتھ لڑ رہا ہے اس کی مدد کریں۔" پولیس وہاں پہنچی اور دیکھا کہ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ پولیس نے بچے سے پوچھا "ان میں سے تمہارا باپ کون ہے؟" بولا "یہ جاننے کے لیے تو یہ جھگڑ رہے ہیں۔" ہالی وڈ کی ایک ماڈل نے اپنے بچے کی سکول ٹیچر سے کہا "میرے بچے سے انٹرویو میں مشکل سوال نہ پوچھنا۔" ٹیچر نے بڑی دیر سوچنے کے بعد بچے سے پوچھا "بیٹا آپ کے ابو کا نام کیا ہے؟" تو ماڈل بولی "میں نے کہا تھا کہ میرے بچے سے مشکل سوال نہ کرنا۔" سیتاوائٹ نے بڑی مشکل سے ٹیرن کے لیے اس مشکل سوال کا جواب ڈھونڈا ہے۔ ہمیں امریکہ میں ناجائز اولاد کو حاصل حقوق کا علم نہیں۔ یہ تو کوئی امریکن اٹارنی ہی بتا سکتا ہے۔ البتہ روس میں اگر ہمسائے کہہ دیں کہ فلاں بندہ اس بچے کا باپ ہے تو حکومت اس شخص کی تنخواہ سے پچیس فیصد کاٹ کر اس بچے کی ماں کو دینے لگتی ہے۔

وہاں ایک بار اعلان ہوا کہ جس کے دس بچے ہوں گے اسے حکومت کی طرف فری فلیٹ ملے گا۔ ایک روسی بیوی نے خاوند سے کہا "میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ ہمارے نو بچے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارا ایک ناجائز بچہ بھی ہے اسے بھی آؤ ہمارے دس ہو جائیں گے اور ہمیں فلیٹ مل جائے گا۔" خاوند کو بات پسند آئی جاکر اپنا وہ بچہ لے آیا۔ گھر آیا تو دیکھا گھر میں نو کے بجائے صرف تین بچے ہیں۔ بیو سے پوچھا "باقی بچے کہاں ہیں؟" بولی "کیا بتاؤں یہ سمجھو ہمارا آئیڈیا چوری ہو گیا۔"

امریکی سڑکیں ڈرائیو کرنے کے لیے کمال کی ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے رکنا نہ اور امریکی عورتیں اچھی ہوتی ہیں اگر آپ نے شادی نہ کرنا ہو' کیونکہ ان کی بریکیں نہیں ہوتیں۔ بیوی اور بیوک کی بریکیں نہ ہونے سے نتیجہ ایک سا ہی نکلتا ہے۔ عورت اور پیشے کا انتخاب مشکل کام ہوتا ہے۔ عمران خان جب کرکٹر تھے' تو ایس باؤلنگ کراتے کہ اگر سامنے بیٹسمین ہوتا تو اسے بولڈ کر دیتے' وومن ہوتی تو بو ہو جاتے۔ البتہ سیاست میں وہ سیتا وائٹ کے ہاتھوں "رن آؤٹ" ہو گئے۔ سیتا نے عمران کو رام کرنے کے لیے کیا یا دام کرنے کے لیے' یہ تو پتہ نہیں لیکن اس کی اِ "بہادری" پر شک ضروری ہے۔ جیسے ایک امریکی فوجی نے اپنے دوستوں کو اپ بہادری کا قصہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک دن ہمارے کرنل نے کہا مجھے نہایت خطرناک کام کے لیے ایک بہت ہی بہادر اور دلیر نوجوان چاہیے۔ اس مشن میں خطرہ بہت ہے جو جوان اس کام کے لیے جانا چاہتا ہے وہ ایک قدم آگے آ جائے تو میں اپنے ساتھیو میں سے آگے تھا "اچھا تم نے ایک قدم آگے بڑھا لیا تھا؟" ایک دوست نے پوچھا۔ بولا "نہیں میرے دوسرے ساتھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔"

کلچر کے ساتھ امریکی لگانا ایسے ہی ہے جیسے شادی شدہ کے ساتھ تقریباً لگانا۔ کہتے ہیں کینیڈا کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہیں موقع ملا تھا کہ وہ فرانسیسی کھانے' برطانو کلچر اور امریکی ٹیکنالوجی حاصل کرتے۔ لیکن انہوں نے برطانوی کھانے' امریکی کلچر اور فرانسیسی ٹیکنالوجی حاصل کر لی۔ امریکہ میں شادیاں' پشاوری چپل جتنی بھی نہیں چلتیں۔ ایک پاکستانی جوڑے نے اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ پر جشن میں امریکی سیا

کو مدعو کیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ پارٹی کس خوشی میں ہو رہی ہے۔ اس نے ایک مہمان سے وضاحت چاہی تو مہمان نے بتایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پورے پچیس سال گزار چکے ہیں۔ امریکی بولا "بہت خوب اور اب یہ شادی کر رہے ہیں؟" البتہ وہاں خواتین آج کل اچھی زندگی گزارنے کے لیے شادیاں کرتی ہیں' کیونکہ طلاق سے اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ وہ اچھی زندگی گزار سکیں۔ سیتا وائٹ کو عمران سے طلاق تو نہیں مل سکتی' لیکن وہ اس پر بھی خوش ہے کہ امریکی عدالت نے عمران کو ٹیرن کا باپ قرار دیا ہے۔ سیتا کے ساتھ ہم بھی خوش ہیں کہ چلو ایک امریکی بچی کو تو پتہ چلا کہ اس کا باپ کون ہے۔

حوائیاں

عورت ہونا ایسا اعزاز ہے جو بہت کم مردوں کو حاصل ہوتا ہے' البتہ ہمارے ہاں منو بھائی صاحب سے متاثر ہو کر خواتین نے اپنے عالمی دن کے موقع پر انہیں اعزازی خاتون قرار دیا تھا' جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ منو بھائی کو نہیں جانتیں یا پھر جانتی ہیں۔ دنیا میں خواتین نے جتنا مرد بننے کی کوششیں کیں' اتنا عورت بننے کے لیے نہیں کیں البتہ آج کل مغرب میں عورت بننے کا فیشن مردوں میں مقبول ہو رہا ہے۔ اس سلسلے

میں کچھ برطانوی خواتین نے ڈگری پر بھی ڈگری دائر کر دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ عورتوں کو بی اے یعنی بیچلر آف آرٹس اور ایم اے یعنی ماسٹر آف آرٹس کی ڈگریاں دی جاتی ہیں جو مردانہ ہیں' انہیں میڈن آف آرٹس اور مسٹریس آف آرٹس کی ڈگریاں ملنا چاہئیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ لندن کی 50 فیصد آبادی ان کے حق میں ہے' اگرچہ انہوں نے آبادی کی جنس کا تعین نہیں کیا' لیکن ہمارے خیال میں معاملہ فرانسیسی ایکٹرس والا ہو گا جو اپنے علاقے سے الیکشن میں کھڑی ہوئی تو اس نے پریس کو بتایا "علاقے کی 50 فیصد آبادی تو میرے خلاف ہے" صحافی نے پوچھا "باقی؟" بولی "باقی پچاس فیصد تو مرد ہیں" بیشتر مغربی ممالک میں ایسی صورت حال ہے کہ ایک امریکی پرائیویٹ فرم کے منیجر نے بتایا کہ دفتر میں کام کرنے والی عورتوں سے مرد سمجھ کر سلوک کریں تو وہ گھر سے نہیں آتیں' البتہ ان کو عورت سمجھ کر سلوک کریں تو بیوی گھر سے نہیں آنے دیتی۔ اس کے باوجود مغرب میں عورت مرد کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چل رہی ہے' کیونکہ وہاں مرد چلتے ہوئے کاندھا نہیں مارتے۔ وہاں تو اب خواتین ہر فیلڈ میں مردوں کے برابر آ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ گنجا ہونے میں بھی۔ ایک تحقیق کی روشنی میں امریکی ماہر ڈاکٹر الفونز ڈی مونٹر کا کہنا ہے "اعلیٰ انتظامی عہدوں پر کام کرنے والی 500 خواتین میں سے 60 فیصد گنجی ہو چکی ہیں۔" گویا اب ہمارے ہاں بھی عورتیں آغا شاہی' امجد اسلام امجد اور سر تاج عزیز بن سکیں گی۔ عمر کے معاملے میں بھی عورتیں مردوں سے آگے ہیں۔ جب سو مردوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو تین چار سو عورتوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔

بابائے نفسیات فرائیڈ کو عورتوں کے امور کا ماہر مانا جاتا ہے' انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ عورت کیا چاہتی ہے؟ شاید اسی لیے اسے عورتوں کے امور کا ماہر مانا جاتا ہے۔ عورت کے بارے میں تو کسی غیر شادی شدہ خاتون کی رائے معتبر نہیں ہوتی' مرد کی کیا ہو گی۔ تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتیں۔ برنارڈ شا کہتا ہے محبت اس دھوکے کا نام ہے کہ ایک عورت دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ بہر حال عورت کو اپنی خامیاں بھول جانا چاہئیں'

کیونکہ کیا یہ ضروری ہے کہ مرد وزن دونوں ایک ہی بات یاد رکھیں۔ ایک ہی فقرے ک
مطلب عورت کے لیے اور ہوتا ہے مرد کے لیے کچھ اور۔ جیسے جب عورت کہ
میرے پاس پہننے کو کچھ نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس پہننے کے لی
کچھ نیا نہیں ہے۔ جب مرد یہ کہتا ہے کہ میرے پاس پہننے کو کچھ نہیں تو اس کا مطلب
ہوتا ہے کہ اس کے پاس پہننے کو کچھ دھلا ہوا نہیں ہے۔

ہم نے ایک عورت سے پوچھا عورتوں کو دنیا میں کتنے مسائل کا سامنا ہے
بولی "دنیا میں کتنے مرد ہیں؟" عورت آج جس مقام پر ہے' یہ سب اس نے اپ
محنت سے حاصل کیا۔ عورت کتنی محنتی ہے' اس کا اندازہ اس سے لگالیں کہ صرف
12 فیصد عورتیں خوبصورت پیدا ہوتی ہیں' باقی اپنی محنت سے بنتی ہیں۔ برطانیہ م
خواتین کو 1948ء تک تو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو یونیورسٹیوں
فارغ التحصیل کہلوا سکیں۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈگریاں نہ دی جاتیں
یہ قانون کیمبرج یونیورسٹی میں بھی لاگو تھا۔ خواتین نے اپنی "ضد و جہد" سے خود
مردوں کے برابر ثابت کیا تو انہیں بی اے' ایم اے کی ڈگریاں دے کر اعزازی م
تسلیم کر لیا گیا۔ اب وہ پھر سے عورت بننا چاہتی ہیں اور میڈن آف آرٹس ا
مسٹریس آف آرٹس بننا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اس سے انہیں یہ فائدہ بھی ہوگا کہ
اے کر کے وہ میڈن آف آرٹ یعنی ایم اے کہلا سکیں گی اور جب وہ مسٹریس آ
آرٹس یعنی ایم اے ہوں گی تو ڈبل ایم ہو چکی ہوں گی۔ ایم بی بی ایس کی ڈگری میں
مرتبہ بیچلر آتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایم بی بی ایس کرتے ہوئے بندے کی
دو بیچلرز جتنی ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہاں بھی لیڈی ڈاکٹرز کو عورت تسلیم کر
کے لیے زنانہ ڈگری دینا پڑے گی۔ ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ ڈگری
کے ساتھ ڈکشنری بھی تبدیل کی جائے۔ سب سے پہلے عورتوں کو نواز شریف
کہنا چاہیے کہ وہ Mandate کا لفظ استعمال نہ کریں۔ آخر عورتوں نے بھی ا
ووٹ دیے ہیں۔ الیکشن سے پہلے نواز شریف نے اپنے Manifesto کا اعلان
تھا۔ اب Womanifesto کا بھی اعلان کریں۔ یہی نہیں Mankind کے سا

Womankind کا لفظ بھی ڈکشنری میں ہونا چاہیے کہ دونوں کے ملنے سے
انسانیت بنتی ہے۔ لفظ Manner صرف مردوں کے اطوار کے لیے استعمال ہو'
عورتوں کے لیے Womanner کا لفظ ہونا چاہیے۔ Manager عورت ہو تو
اسے Womanager لکھا جائے۔ اگرچہ Woman کے ساتھ Ager لکھنا ایسا
ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ وہ بھاگ کھڑا ہو' کیونکہ وہ بیک وقت دو کام کیسے کر سکتا ہے یا
بھاگا ہو گا یا کھڑا ہوا ہو گا' البتہ Mania جو پاگل پن کی بیماری ہے' اس کا نام شاید
عورتیں نہ ہی تبدیل کرانا چاہیں۔ بہر حال زمانے کے ساتھ ساتھ لفظ بھی بدلنے
چاہئیں۔ زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ پہلے لڑکی گھر اور والدین کو سنبھالتی تو والدین کہتے
یہ تو ہمارا بیٹا ہے۔ اب اگر بیٹا گھر اور والدین کو سنبھالنے والا ہو تو والدین کہتے ہیں یہ
تو ہماری بیٹی ہے۔

مزید حوائیاں

یہ بات ہمیں بچپن ہی سے غلط لگتی کہ مشرق میں میل ڈومینیٹنگ معاشرہ
یعنی مرد راج ہے' کیونکہ ہمارے مشرق میں جو گھر تھا وہاں ایسا نہ تھا' ویسے بھ
میں سب سے زیادہ زن مرید مشرق میں ہی پائے جاتے ہیں' جس کی وجہ یہ تھ
مشرقی لوگ روحانیت پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور پیر پرست ہوتے ہیں' کیو
عورت پیر ہو جائے اس کا کوئی مرید نہیں رہتا' سب جوان عورتوں کے مرید

ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے گھروں میں بڑے بڑے فیصلے مرد ہی کرتے ہیں جیسے اسرائیل کو تسلیم کرنا چاہیے یا نہیں' مسئلہ کشمیر کیسے حل ہونا چاہیے' بھارت سے تجارت ہونی چاہیے یا نہیں جبکہ چھوٹے چھوٹے فیصلے مثلاً رات کو کیا پکانا ہے' گھر کے لیے شاپنگ کیا کرنی ہے' بچوں کے رشتے کہاں کہاں کرنے ہیں وغیرہ وغیرہ عورتیں کرتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ مشرق اور ایشیا میں مردانہ معاشرہ ہے لیکن سنٹرل ایشیا میں ایسا نہیں رہا۔ ڈیلی نیوز ویک کی ایک سٹرانگ رپورٹ کے مطابق روسی مرد صدر ریلسن سے لے کر ڈپٹی پرائم منسٹر اور عام مرد تک ہر کوئی بحران اور ڈیپریشن کا شکار ہے۔ رسالے نے انکشاف کیا ہے کہ روس میں 1989ء سے لے کر 96ء تک مردوں کی اوسط عمر گھٹ کر 53 سال رہ گئی ہے' جبکہ عورتوں کی اوسط عمر 73 برس ہے۔ عورتیں ترقی کر رہی ہیں جبکہ وہاں کے مرد بوڑھا ہونے کے علاوہ کوئی قابل ذکر کام نہیں کرتے۔

روس وہ ملک ہے جہاں آپ کو ہر طرف عورتیں ہی نظر آتی ہیں' جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ دیکھتے ہی انہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ وہاں عورتیں ہیں بھی بہت۔ ایک روسی مزاح نگار لکھتا ہے کہ ''ہماری عورتوں میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔'' لیکن اعداد و شمار کے حساب سے مسئلہ کوانٹٹی کا نہیں کوالٹی کا ہے۔ وہاں کی عورتیں اتنی محنتی اور کام کرنے والی ہیں کہ روسی مترجم رادا انکیا جب پاکستان آئی تو چند دوستوں کی بیویوں سے گھروں میں ملاقات کرنے کے بعد بولی' جب میں پاکستان نہیں آئی تھی تو سمجھتی تھی یہاں مرد موج کرتے ہیں اور عورتیں پسی ہوئی ہیں۔ یہاں کی عورتوں کو مل کر لگا کہ عورتیں آرام کرتی ہیں اور مرد پستے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں سارا دن گھروں میں آرام ہی کرتی ہیں' ان عورتوں کو دیکھ کر رادا انکیا کو اپنے مرد یاد آئے۔ ہم جب بھی روسی ریاستوں میں گئے تو عورت یاترہ کے بعد ہمیں اپنے مرد یاد آنے لگے۔ وہاں کی عورتیں ہمارے مرد ہیں' وہ سارا دن کام کرتی ہیں' وہاں ایک عورت دن میں پانچ مردوں جتنا کام کرتی ہے۔

روس کا تاریخ جغرافیہ مردوں کے لیے تاریک جغرافیہ ہے' وہاں پہلے ایسے قبیلے آباد تھے' جن کی حکمران عورتیں ہوتی تھیں پھر ان عورتوں کی حکومتیں سمٹتی سمٹتی گھروں تک آ پہنچیں اب وہاں بھی عورتیں ایک ایک دو دو گھروں بلکہ فلیٹوں پر حکومت کرتی ہیں' ہماری عورتیں اپنے گھر سے وفاداری ہوتی ہیں وہ اپنے فلیٹ سے۔ ایک ایسی روسی لڑکی دوسری سے کہہ رہی تھی ''میرے خاوند نے فلیٹ خریدا' لیکن وہ بہت برا ہے میں اسے بدل رہی ہوں' دوسری نے پوچھا ''کیا فلیٹ بدل رہی ہو؟ بولی ''نہیں خاوند'' ہمارے ہاں مردوں نے گھر میں بیویاں رکھی ہوتی ہیں۔ وہاں عورتوں نے گھر میں خاوند رکھے ہوتے ہیں' جیلیں وہاں واحد جگہ ہیں جہاں عورتیں مردوں سے کم ہیں۔ وہ ایک بیدار قوم ہیں بشرطیکہ قوم سے مراد صرف عورتیں ہوں۔ ویسے بھی قوم عورتوں سے بنتی ہے' مردوں سے بنتی ہوتی تو قوم مذکر ہوتی۔ ہمارے ہاں عورتوں نے مردوں کو آگے لگا رکھا ہے' وہاں عورتوں نے مردوں کو پیچھے لگا رکھا ہے۔ ہر کام میں عورتیں آگے مرد پیچھے' جس کی وجہ ہمارے ایک پاکستانی مفکر نے وہاں کی عورتوں کا لباس بتائی۔ وہ کہتے ہیں ایسا لباس پاکستانی عورتیں بھی پہنیں تو کوئی مرد ان سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ جہاں تک وہاں کی عورتوں کی عمریں لمبی ہونے کی بات ہے تو ہم سمجھتے ہیں یہ بات وہاں کی عورتوں کے حق میں نہیں۔ عمر عورت کی واحد کمزوری ہے۔ کسی عورت سے عمر پوچھنا اسے جھوٹ بولنے کے لیے ورغلانے کے مترادف ہے۔ ہماری عورتوں کی طرح وہاں کی عورتیں بھی عمر کے بارے میں سچ تب ہی بولتی ہیں' جب وہ دوسری کی عمر کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ کسی عورت کو لمبی عمر کی دعا دینا دراصل اسے طویل بڑھاپے کی بددعا دینا ہے۔ سو مردوں کی اوسط عمر کم کرنے پر ڈیپریشن کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیپرس تو عورتوں کو ہونا چاہیے جن کا بڑھاپا طویل ہو رہا ہے۔ پھر روس جوانوں کے رہنے کے لیے تو ٹھیک ہے بوڑھوں کے رہنے کے لیے اس سے بری جگہ پورے ایشیاء میں نہیں۔

پاپ رے پاپ

صاحب کیسا زمانہ آگیا ہے پستول تو سائیلنسر والے ملتے ہیں لیکن رکشے سیاستدان اور گٹاریں بغیر سائیلنسر کے۔ موسیقی کے ایک نقاد نے کہا تھا امریکہ میں ہر روز 80 ملین پونڈ کوڑا کرکٹ اکٹھا ہوتا ہے' لیکن آج تک یہ بھی پاپ کے ریکارڈوں کا ریکارڈ نہیں توڑ سکا۔ ہمارے ہاں بھی سب سے مہنگا شور پاپ میوزک ہی کہلاتا ہے۔ جیسے زنانہ اور مردانہ گانوں میں یہ فرق ہے کہ مردانہ گانوں سے لطف اندوز ہونے کے

لیے موسیقی کا علم چاہیے اور زنانہ موسیقی سے انجوائے کرنے کے لیے نظر کی عینک۔ ایسے ہی دوسرے میوزک اور پاپ میوزک میں یہ فرق ہے کہ ایک میں گانے والے کو ریاض کرنا پڑتا ہے اور دوسرے میں سننے والے کو۔ پاپ میوزک کمیونزم کی طرح ہے۔ روس میں کمیونزم کے بارے میں کہا جاتا تھا جو 30 سال کی عمر تک کمیونسٹ نہیں بنتا اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں اور اس کی بھی جو تیس سال کا ہونے کے بعد بھی کمیونسٹ ہے۔ پاپ میوزک تب تک بندے کو سمجھ نہیں آتا جب تک اسے بند نہ کر دیا جائے۔ سو ممکن ہے وزیر اعظم پاکستان نے اسے ٹی وی پر بند کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ ہمیں میاں صاحب اتنے پسند ہیں کہ موسیقی میں بھی ہمیں میاں صاحب کی ٹوڈی ہی پسند ہے، لیکن لگتا ہے انہیں موسیقی کی سمجھ نہیں ورنہ وہ یہ صحیح فیصلہ نہ کر پاتے۔

مہدی حسن خاں صاحب تو پاپ میوزک کو پاپ کا میوزک کہتے ہیں۔ پاپ کا مطلب ہے تیزی سے ہلنا یا ہلانا اور پاپ نے میوزک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ دراصل دوران موسیقی لوگوں کو باتیں کرنے سے روکنے کے لیے ایجاد ہوا تھا، کیونکہ اس کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ ساتھ بیٹھی بیوی کی اونچی بات بھی سنائی نہیں دیتی۔ ہمارے موسیقی کے استاد تیزی کو اتنا ناپسند کرتے ہیں کہ استاد سلامت علی لکشمی چوک سے اپنی ترنگ میں رکشے میں بیٹھے اور کہا "لکشمی چوک لے چلو۔" رکشہ ڈرائیور نے کہا "استاد جی یہ لکشمی چوک ہی ہے۔" تو استاد جی نے دوسری طرف سے اترتے ہوئے ڈرائیور کو پانچ روپے کا نوٹ دیا اور کہا "دوبارہ اتنی تیز نہ چلانا۔" پاپ بھاگتے دوڑتے شاید اس لیے گایا جاتا ہے کہ سننے والے پکڑ نہ پائیں ویسے تو ہمارے پاپی گلوکاروں پر پاپ کی بڑی مہربانیاں ہیں، وہ جو حرکتیں کرتے ہیں، اگر پاپ میوزک نہ ہو تو یہ کچھ کرنے پر انہیں مینٹل ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے۔

امریکی راک میوزیشن فرینک زیپا نے کہا تھا "پاپ نئی سیاست ہے" بُرے سے بُرا پاپ بھی سیاستدانوں کے بیانوں سے اچھا ہوتا ہے۔" اگرچہ اس سے پاک میوزک کی بجائے سیاست کے بارے میں موصوف کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارا بھی خیال ہے کہ

پاپ میوزک سے سیاستدانوں کے بیان زیادہ لاؤڈ ہوتے ہیں، پھر پاپ میوزک سے بیماریاں نہیں پھیلتیں جبکہ ماہرین کی رائے ہے کہ تھوکنے اور بیان دینے سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اسی لیے پروفیسر خالدہ ترین صاحبہ نے مینٹل ہیلتھ ڈے پر سیاست دانوں سے اپیل کی تھی کہ آج کے دن کوئی بری بات نہ کریں، کیونکہ ان کے بیانوں سے عوام اعصابی تناؤ، مایوسی اور دوسرے ذہنی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن کسی سیاستدان کا سارا دن کوئی بری بات نہ کرنے کا مطلب ہے سارا دن چپ رہنا، لیکن سیاست دان اور بچہ تب تک چپ نہیں ہوتا۔ جب تک اس کے منہ میں کچھ نہ ہو۔ بہر حال اگر حکومت صرف پاپ پر پابندی لگا کر "شور شرابہ" ختم کرنا چاہتی ہے تو اس سے صرف شور ہی ختم ہو گا۔

بابائے حقہ

ہم سے کوئی پوچھے کہ حقہ کس کی دریافت ہے تو ہم کہیں گے نوابزادہ نصر اللہ خان کی، کیونکہ ہم نے ہمیشہ نواب صاحب کو حقے کے بارے میں ہی دریافت کرتے دیکھا۔ حقہ اور امریکہ میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں آلودگی پھیلاتے ہیں، لیکن حقہ دریافت کرنا امریکہ سے زیادہ مشکل تھا کیونکہ امریکہ اتنا بڑا تھا کہ اسے کوئی بھی دریافت کر سکتا تھا۔ امریکی کولمبس سے خوش ہیں کہ اس نے امریکہ

دریافت کیا حالانکہ کولمبس یہ دریافت نہ کر کے ساری دنیا کو خوش کر سکتا تھا۔ حقہ پینا ایک آرٹ ہے۔ ویسے تو آرٹ بھی حقہ پینا ہی ہے۔ لگتا ہے فیروز اللغات مرتب کرنے والے الحاج مولوی فیروز الدین کے زمانے میں بھی سیاستدان حقہ کشی کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے لغت میں حقہ باز کا مطلب مداری لکھا ہے۔ کہتے ہیں کیلیفورنیا رہنے کے لیے آئیڈیل جگہ ہے۔ اگر آپ سنگترے ہوں ایسے ہی آج کل عرب میں آپ کو تب ہی منہ لگایا جائے گا۔ اگر آپ حقہ ہیں تو۔ وہاں کے ہوٹلوں میں سویٹ ڈش کے طور پر حقہ درج ہوتا ہے، جس کے آئس کریم سے زیادہ فلیور ہیں۔ جیسے سٹرابری حقہ، چیری حقہ، مینگو حقہ، اورنج حقہ وغیرہ وغیرہ۔ پہلے وہاں سیاسی حقہ بھی ملتا تھا، لیکن اب اسے مینو سے نکال دیا گیا ہے، کیونکہ اسے جو بھی پیتا وہ بل دینے سے مکر جاتا۔ حفیظ جالندھری صاحب کو مناظر فطرت سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ شاعری میں ہی نہیں سالن میں بھی کسی نہ کسی درخت کا پتہ ضرور ڈال دیتے۔ ایسے ہی نواب صاحب ہر چیز میں حقہ ڈال دیتے ہیں۔ پہلے حقہ ثقافت کا حصہ تھا اب سیاست کا ہے۔ عرب آج کل اپنا کلچر ایکسپورٹ کر رہے ہیں، دبئی جا کر تو لگتا ہے۔ انہوں نے کر بھی دیا ہے۔ عرب آج کل شمالی امریکہ میں حقے کی مارکیٹ بنا رہے ہیں۔ ویسے تو نواب صاحب آج کل فارغ ہی ہیں۔ وہ فارغ بھی ہوں تو لگتا ہے حقے کی پبلسٹی کمپیئن میں بزی ہیں۔ انہیں بھی یہاں سے حقے امریکہ ایکسپورٹ کرنے چاہئیں۔ زار روس کے زمانے میں آزادی کی جدوجہد کرنے والے ایک ازبک سے کسی نے پوچھا "آزاد ہو کر کیا کرو گے؟" بولا "کھیرے امریکہ بھیجیں گے۔" کسی نے کہا "وہ فیشنی لوگ ہیں اگر انہوں نے کھیرے نہ کھائے تو......؟" ازبک میاں سے تلوار نکال کر بولا "پھر یہ تلوار کس لیے ہے؟" ہو سکتا ہے امریکی حقہ نہ پئیں اور ان کا حقہ پانی بند کرنا پڑے۔

برازیل

صاحب امریکیوں کی بے عزتی کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم اپنی طرف سے ان کی بے عزتی کر رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ سمجھتے ہیں ان کی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ جیسے برازیل میں جب کلنٹن کے استقبال میں آنے والے لوگوں نے ایسی شرٹس پہنیں جن پر دھڑ بلیک ڈاگ کا اور سر کلنٹن کا لگا ہوا تھا تو ہمیں برازیل، براذلیل لگا۔ ہم نے سوچا اب صدر کلنٹن کو بھی صدر ایوب سمجھا جانے لگا ہے۔ صدر ایوب کی تصویریں تو آج

کل صرف ٹرکوں کے پیچھے ہی نظر آتی ہیں، شاید ڈرائیور یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ٹرک یوں چلاتے ہیں جیسے صدر ایوب ملک چلاتے تھے۔ صدر ایوب جب صدر عیوب کہلائے تو گلی کوچوں میں جلوس نکلنے لگے۔ ان جلوسوں کو دیکھ کر لگتا لوگ کتوں کے خلاف مہم چلا رہے ہیں، لیکن وہ بھی اپنی ناپسندیدگی میں اتنے پاپولر نہ ہوئے کہ شرٹس پر ان کی تصویریں چھپتیں۔ کلنٹن کی یہ تصویریں دیکھ کر ہم نے ایک دانشور سے کہا کہ کلنٹن کو تو بہت ناپسند کیا جاتا ہے۔ تو دانشور نے بتایا "اس کا مطلب ہے تم امریکیوں کو نہیں جانتے، وہ تو اپنے صدر سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں کہ صدر انہیں بلیک ڈاگ کی طرح عزیز ہے۔"

ہم نے مانا کہ وہاں کتوں کو وہ مقام حاصل ہے، جس کے لیے ہمارے ہاں بڑی دم ہلانا پڑتی ہے۔ ہالی ووڈ کی ایک مشہور اداکارہ سے دی ٹائمز کے نمائندے نے پوچھا "پتہ چلا ہے آپ نے ایک فلم ساز سے شادی کر لی ہے؟" وہ بولی "نہیں آج کل ہم اکٹھے رہ رہے ہیں، اگر میرے کتے اور اس کی بلی کی آپس میں دوستی ہو گئی تو ہم شادی کر لیں گے۔" مارک ٹوئن کہتا ہے "کتے اور انسان میں یہ فرق ہے کہ اگر آپ کسی بھوکے کتے کو لے کر اسے کھلا پلا کر موٹا کر لیں تو وہ آپ کو کاٹے گا نہیں۔" ہم کتوں کو گھر میں رکھنے کے حق میں نہیں کہ اس سے کتوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ماہر کتا کہتے ہیں کتا جتنا ڈرپوک ہوتا ہے اتنا اونچا بھونکتا ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کتا لطیفوں پر ہنستا بھی ہے، مگر اپنی دم سے۔ شاید اسی لیے شیخ رفیق صاحب کا کتا انہیں دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے۔ کتے دو قسم کے ہوتے ہیں ان میں کچھ چار ٹانگوں والے بھی ہوتے ہیں۔ نیو انگلش ڈکشنری میں سترہویں صدی کے بعد کتے کا مجازی مفہوم ہے۔ خوش باش آدمی، مزے کا آدمی، یار دوست، بہر حال جب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ کلنٹن کو بلیک ڈاگ کہنا ان کی تعریف کرنا ہے تب سے ہمارا دل بھی ان کی تعریف کرنے کو چاہ رہا ہے۔

خر-گوشیاں

ہمیں یہ علم تو نہ تھا کہ خر کتنا سنتا ہے۔ یہ پتہ تھا کہ امریکہ میں اس کی بڑی ق
جاتی ہے۔ خر کو لوگوں نے ووٹ دیئے اور کلنٹن جیت گئے۔ تب سے ہم امریکیو
کی سرگوشیوں کو خرگوشیاں ہی کہتے ہیں۔ سنا ہے دنیا میں جو زیادہ بولتے ہیں وہ
سنتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ جو زیادہ جاگتے ہیں وہ کم سوتے ہیں۔ اور
زیادہ سوتے ہیں وہ کم جاگتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا ہے امریکی صدر کلنٹن

سننے لگتے ہیں، ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا پڑھ کر تو ہمیں یہی لگا کہ وہ صدر بننے سے پہلے بھی کم ہی سنتے تھے۔

امریکی عجیب وامیر قوم ہیں، وہ تو میچ دیکھنے گراؤنڈ میں جائیں تو ساتھ ریڈیو ضرور لے جائیں گے تاکہ کمنٹری سن کر پتہ چلتا رہے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ ان کا قول ہے کہ آدمی کو تب تک ٹھوکر نہ مارو جب تک وہ پہلے گرا ہوا نہ ہو۔ وہاں کی نئی نسل اتنا کم سنتی ہے کہ اسے سننے کے لیے فل آواز میں میوزک لگانا پڑتا ہے۔ امریکی بچوں کو اپنے والدین سے ایک تو یہ شکایت ہے کہ والدین ان کے ہم عمر نہیں ہیں اور دوسری یہ کہ وہ سنتے بہت ہیں۔ کسی امریکی بچے کے کان چیک کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے کوئی کام کرنے سے منع کرو۔ اگر وہ آپ کی بات مان لے تو سمجھ لیں اس کے کان ٹھیک نہیں ہیں۔

امریکہ کے جتنے صدر گزرے ہیں جب بھی پاکستان کے مفادات کی بات ہوئی تو ہمیں یہی لگا کہ وہ کم سنتے ہیں یا پھر ہمارا مواصلاتی نظام ہی ایسا ہے کہ ہماری بات ان تک پہنچتی ہی نہیں۔ جیسے ایک روسی نے کہا تھا "ہمارا مواصلاتی نظام اتنا بے کار ہے کہ دو سال سے خدا سے کہہ رہا ہوں، مجھے لاکھ ڈالر دے دے، میری آواز ابھی تک خدا تک نہیں پہنچی۔" ویسے جہاں تک امریکیوں کا ہے تو وہ جو سننا چاہیں انہیں وہی سنائی دیتا ہے۔ اس کا اندازہ تازہ روسی لطیفے سے لگالیں۔ میخائل گورباچوف زیر جامہ میں باہر بالکونی میں کھڑا تھا تو رئیسہ گورباچوف کچن سے چلانے لگی "میخائل کپڑے پہن لو" وہ بولا "ہیں! کیا میں تمہیں کچن میں نظر آرہا ہوں۔" تو رئیسہ بولی "نہیں میں وائس آف امریکہ سن رہی ہوں۔"

مِسز آلو

ہمارے ہاں سیاست میں عورتوں کی اہمیت اتنی ہی رہی، جتنی کچن میں سبزی کی لیکن بہار کی وزیراعلیٰ ربڑی دیوی کا سیاست میں وہ مقام ہے جو سبزیوں میں آلو کا ہوتا ہے، عورتیں پیدائشی حکمران ہوتی ہیں، طلاق پر انہیں وہی دکھ ہوتا ہے جو نواز شریف یا بینظیر کو اپنی اسمبلی ٹوٹنے پر۔ ربڑی دیوی، لالو پرشاد کی بیوی ہیں۔ لالو پرشاد انہیں یاد نہ ہوگا، جنہیں لطیفے یاد نہیں رہتے۔ ایک زمانے میں اس کے

لیے بہار میں نعرے لگتے۔

جب تک سموسے میں الو رہے گا
پٹنہ بہار میں لالو رہے گا

اب سیاست کے سموسے میں آلو کی جگہ ربڑی دیوی نے لے لی ہے، ربڑی دیوی نے کہا ہے "دودھ دوہنا اور حکومت کرنا ایک جیسے کام ہیں۔ جسے پتہ ہو دودھ کیسے دوھیا جاسکتا ہے وہ بآسانی حکومت کر سکتا ہے، جیسے میں کر رہی ہوں۔" ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ حکومت کرنے کے لیے کسی کوالیفی کیشن کی ضرورت نہیں، وہ بھی کر سکتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا لیکن اب پتہ چلا جیسے انکم ٹیکس کے ملازم کے لیے یہ صلاحیت ضروری ہے کہ وہ نچوڑے ہوئے لیموں کو نچوڑ سکے، ایسے ہی وزیراعلیٰ بننے کے لیے دودھ دوہنے کا تجربہ ضروری ہے تاکہ دودھوں نہا سکے اور اگر موقع ملے تو آگے چل کر پوتوں پھل سکے۔

لالو پرشاد یادو جب وزیراعلیٰ بہار بنے تو انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پٹنہ کی سڑکیں ایسی بنادوں گا جیسے ہیما مالنی کے گال۔ کسی نے شکایت اور وعدہ یاد دلایا کہ آپ نے ہیما مالنی کے گالوں جیسی سڑکیں بنانے کی بات کی تھی، لیکن ان سڑکوں پر بڑے بڑے گڑھے ہیں۔ تو لالو بولا "اس کا مطلب ہے تم نے ہیما مالنی کے گال نہیں دیکھے۔" انگریز بچے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ شریر، بہت شریر اور حد سے زیادہ شریر جبکہ ہندوستانی بچے دو سو اکاون قسم کے ہوتے ہیں۔ ربڑی دیوی کے بچے صرف نو قسم کے ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نو بچوں کی ماں کے لیے حکومت سنبھالنا مشکل ہوگا، لیکن ہمیں اس کی یہی خامی، خوبی لگی۔ ہم سمجھتے ہیں ربڑی دیوی بخوبی حکومت اس لیے نہیں چلا رہی کہ اسے دودھ دوھنا آتا ہے بلکہ یہ سب نو بچوں کی وجہ سے ہے۔ بچے سنبھال سنبھال کر اس کا اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ بخوبی بڑی سے بڑی کابینہ کو ہینڈل کر سکتی ہے۔

س-ی، ک-س

بابائے اردو لفظ بوسہ کو فحش سمجھتے ہوئے اسے بوسہ لکھنے کی بجائے ب و ۳
لکھتے۔ بقول ایک مزاح نگار اس طرح وہ اس کی طوالت اور لذت میں اضافہ کرد۔
ایسے ہی ہمیں سیکس لکھنا فحش لگ رہا ہے۔ سو ہم نے اسے اس طرح ہجوں میں بانٹ
ہے، جس طرح ہجے کر کر کے ہم اپنی اداکاراؤں کی تصویریں دیکھتے ہیں۔ آ
اخباروں میں سیاسی سیکس سکینڈل چھایا ہوا ہے۔ کبھی خیال آتا ہے جب اخبار نہیں

لوگ پریشان کیسے ہوتے تھے۔ انہیں بری خبریں کون سناتا تھا۔ اگرچہ اس کا جواب اتنا بھی مشکل نہیں، کیونکہ شادیاں تو تب بھی ہوتی تھیں بہرحال آج کل آصف زرداری کے بارے میں بڑی پریشان کن خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ ایسی پریشان کن کہ بندہ نہ پڑھے تو پریشانی ہوتی ہے۔ کچھ خبریں ان کے بارے میں نہیں ہوتیں مگر ہماری لذتیت اس میں سے آصف زرداری ڈھونڈ نکالتی ہے، جیسے یہ خبر کہ ناروے میں مونچھوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ صاحب ہم نے ناروے کے بارے میں اردو ادیبوں کے جتنے سفرنامے پڑھے ہیں انہیں پڑھ کر لگتا ہے وہاں عورتیں ہی رہتی ہیں اور عورتوں کی مونچھیں اتنی نہیں ہوتیں کہ ان کا مقابلہ کرایا جاسکے، البتہ ان کی کلین شیو کا مقابلہ کرایا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں وہاں اکثر شادیاں سہاگ رات ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ سنا ہے وہاں رات چھ ماہ کی ہوتی ہے۔ اگر شادی پسند کی نہ ہو تو سہاگ رات ہمارے ہاں بھی اتنی لمبی ہو جاتی ہے۔ بہرحال وہاں مونچھوں کے مقابلے کے انعقاد سے مراد ہے کہ غیر مقامی مچھل اس میں حصہ لیں گے۔ ہمارے ہاں مونچھوں کو وہی مقام حاصل ہے جو مردوں میں آصف زرداری کو حاصل ہے۔ ہمیں آصف زرداری کی مونچھیں ہمیشہ اچھی لگیں۔ یہی مونچھیں تو اصل زرداری ہیں اسی لیے مرتضی بھٹو کے قتل کے بعد حفاظتی اقدامات کے طور پر آصف زرداری نے اپنی مونچھیں انڈر گراؤنڈ کر لیں اور لوگوں کے لیے پتہ چلانا مشکل ہو گیا کہ آصف زرداری کون ہے؟ ابھی تک اخبارات یہی بتانے میں لگے ہوئے ہیں کہ آصف زرداری کون ہے۔ اگر بے نظیر حکومت ہوتی تو آج آصف زرداری ناروے کے مقابلہ مونچھ میں اول انعام حاصل کر کے ہماری مونچھ اونچی کر چکے ہوتے۔ آصف زرداری نے دنیا میں پاکستان کا جتنا نام روشن کیا ہے۔ اتنا تو ہزار واٹ کے بلب سے کمرہ روشن نہیں ہوتا۔ پاکستان دنیا بھر میں کرپشن میں دوسرے نمبر پر آگیا۔ ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ اس میں اتنے فخر والی کیا بات ہے؟ کون سا پہلے نمبر پر آیا ہے، لیکن ہمارا خیال ہے اگر انہیں موقع دیا جاتا تو وہ یہ "رتبہ بلند" بھی ہمیں دلوا دیتے، لیکن اخبارات خواہ مخواہ ان کے خلاف کچھ نہ کچھ چھاپتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں ہم بھی خواہ مخواہ ان کے خلاف کچھ

نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ سیاسی سیکس سکینڈل کی خبریں پڑھ کر تو لگتا ہے ہم خبریں دیکھ رہے ہیں۔ ہماری فلمی ہیروئنوں اور فلموں کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ تین گھنٹے ہوتا جیسے فلاڈیلفیا کے میئر اور پولیس چیف فرینک ایذو نے کہا تھا "فلاڈیلفیا کی گلیاں تو بڑی محفوظ ہیں یہ صرف لوگ ہیں جو انہیں غیر محفوظ بناتے ہیں۔" سو ہماری فلمیں تو معیاری ہیں جنہیں دیکھنے والے غیر معیاری بناتے ہیں۔ اگر وہ نہ دیکھیں تو فلمیں معیاری ہی ہیں۔ جیسے ہمارے ایک مقبول شاعر کے بارے میں ایک نقاد نے کہا کہ میں اسے بڑا شاعر مانتا تھا، لیکن پھر ایک دن میں نے اس کی شاعری پڑھ لی۔ خبروں کے مطابق سابق مرد اول نے جس ملک میں جانا ہوتا وہاں پہلے ہی پاکستان کی ٹاپ کلاس بلکہ ٹاپ گلاس ہیروئنیں پہنچادی جاتیں۔ ان میں سب ہیروئنیں ٹاپ والی ہی نہیں کچھ ٹاپ لیس بھی ہوتیں۔ ان خبروں پر ہمیں جو اعتراضات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں آصف زرداری کو سابق مرد اول لکھا گیا ہے، حالانکہ مرد کبھی سابق نہیں ہوتا بلکہ حسب سابق ہوتا ہے۔ خبر میں لکھا گیا ہے کہ بیرون ملک دوروں میں وہ اپنی زوجہ سے چھپ کر ان لڑکیوں تک پہنچتے۔ اس خبر سے یہ پتہ چلتا کہ زوجہ سے مراد کون ہے، کیونکہ ر رشید تو فرماتے ہیں آصف زرداری پیپلز پارٹی کو اپنی زوجہ سمجھتے ہیں۔ ایک کالم نگار لکھا ہے کہ آصف زرداری جن ملکوں کے دوروں پر پاکستانی لڑکیاں منگواتا، وہاں حسن ہے کہ یہ بات درست نہیں لگتی۔ بظاہر لگتا ہے انہوں نے آصف زرداری حمایت کی ہے، حالانکہ انہوں نے "بین المستور" انہیں بذوق قرار دیا ہے جو ا اداکاراؤں پر اتنا خرچہ کرتے تھے، جن سے کئی درجہ بہتر لڑکیاں انہیں وہاں کوڑ کے مول مل سکتی تھیں، انہیں کوڑوں کے مول یہ پاکستان سے منگوانے کی ضرورت تھی۔ فلمی اداکاراؤں نے اس سکینڈل پر جو کہا اسے پڑھ کر لگتا ہے دوسری کی طرح ہماری فلمی ہیروئنیں بھی اپنا قد بلند کرنے کے لیے سینڈل اور سکینڈل کا ہی لیتی ہیں، لیکن کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ آصف زرداری کو اپنی ثقافت سے پیار ہے کہ اس نے وزیراعظم ہاؤس کو "اپنی" ثقافت کا نمونہ بنادیا تھا۔ وہ اس ثقافت ہر جگہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے جیسے یحییٰ خان کے نظریات بھی پی ٹی وی کی

کے تھے، وہ گانوں کو ہی پاکستان کی ثقافت سمجھتے تھے۔ اس لیے جن دنوں مشرقی پاکستان بحران کی زد میں تھا اور یحییٰ مجیب مذاکرات چل رہے تھے۔ اس وقت یحییٰ خان اپنے سیکرٹری پر 15 منٹ محض اس لیے برستے رہے کہ ان کا ریکارڈ پلییر ڈھاکہ لیٹ پہنچا تھا۔ سو آصف زرداری صاحب نے یہ سب اپنی ثقافت کے فروغ کے لیے کیا ورنہ جن ممالک میں وہ ریما، میرا، ریشم، صائمہ جیسی لڑکیاں لے جاتے تھے وہاں ایسی لڑکیاں لے جانا ایسے ہی ہے جیسے بندہ سیاچن گلیشیر پر جائے اور ساتھ تھرموس میں ٹھنڈا پانی بھر کر لے جائے یا بندہ فائیو سٹار ہوٹل میں کھانے کی دعوت پر جائے اور جیب میں گھر سے برگر رکھ کر لائے، البتہ ہمیں آصف زرداری کو برا بھلا کہنے کی بجائے ان کی حب الوطنی کی داد دینا چاہئے کہ وہ بیرون ملک جا کر بھی اپنی "ثقافت" کو نہیں بھولے۔

سگ باش

ایک زمانہ تھا کہ سلطنت برطانیہ میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اس کی وج
ہمارے ایک دوست یہ بتاتے ہیں کہ خدا اندھیرے میں ایک انگریز پر بھروسہ نہیر
کرسکتا۔ 1572ء میں ایک دانشور نے کہا "دنیا کے چاروں کونوں میں جو ہمسا
کی چوری کرے اس کے تین نام ہیں قذاق' لٹیرا' یا انگریز۔" اب چاروں کونوں ک
بات نہیں رہی کیونکہ یہ ثابت ہوچکا کہ دنیا گول ہے۔ اس کے کونے نہیں ہیں پھ

بھی ہر جگہ سب سے زیادہ مسئلہ جو درپیش ہے۔ اس کا نام ایک ہی ہے وہ ہے امریکہ۔ امریکہ میں اکیلے پوری دنیا کو تباہ کرنے کی طاقت تو ہے مگر پوری دنیا کو بچانے کی نہیں' امریکہ کو دنیا میں سب سے زیادہ خطرہ امریکیوں سے ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ دنیا کے سب سے بڑے مسئلہ کا 1997ء کا سب سے بڑا مسئلہ کون سا رہا۔ واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ کا 1997ء کا سب سے بڑا مسئلہ کلنٹن کے کتے کا نام رکھنا تھا۔

امریکی قوم سب کچھ کرسکتی ہے نہیں کرسکتی تو وہ آرام نہیں کرسکتی۔ امریکی اپنے گھر بھی یوں جاتے ہیں جیسے دفتر جارہے ہوں یا ٹورسٹ ہوں۔ وہ ہر سال ہزاروں نئے ناول خریدتے ہیں' مگر ایک دو صفحے سے زیادہ پڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں۔ ہنسنے کے لیے وہ کامیڈی شو کی ٹکٹیں لیتے ہیں اور کامیڈین کو ہنستے ہوئے دیکھتے ہیں' کیونکہ ان کے پاس خود ہنسنے کے لیے وقت نہیں۔ وہ وفادار جیون ساتھی چاہتے ہیں تو کتا پال لیتے ہیں۔ کتوں کی ان ممالک میں بڑی قدر ہوتی ہے' جہاں وفا کم ہوتی ہے۔ امریکہ میں تو یہ طے کرنا کہ کس گھر میں کتا نہیں بہت آسان ہے۔ یہ ان خواتین کے ہاں نہیں جو اپنے خاوندوں کے ساتھ واک پر نکلتی ہیں۔ وہاں تو کتے کے بغیر فیملی مکمل نہیں ہوتی' بلکہ اس کے بغیر تو کتے کی فیملی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ الیگزینڈر پوپ نے ایک خط میں لکھا تھا کہ تاریخ جتنی کتوں کی وفا کی مثالوں سے بھری ہے۔ اتنی انسانوں کی نہیں۔ خیر اب تو کتے بھی بے وفا نکلنے لگے ہیں' جس سے اندازہ لگالیں کہ جانوروں پر انسان کی صحبت کا کتنا اثر پڑتا ہے۔ اچھے کتے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کم کتا ہوتا ہے۔ ہالی وڈ میں تو ہیروئنیں لباس سے میچ کرتے کتے کے ساتھ واک کو نکلتی ہیں اور وہاں دنیا کے سب سے چھوٹے کتے فیشن میں ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کئی سیاست دان کتوں کے بڑے فیورٹ ہیں۔ بعض کے گھر جاؤ تو ان کے ہاں آپ کو کتے نظر نہیں آتے' لیکن ان کے رویے سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں ہیں ضرور۔ کتوں کا نام رکھنا وہاں بڑا سوچ بچار کا کام ہے' کسی بچے کا نام تو رکھنا نہیں کہ جو دل میں آیا رکھ دیا۔ صدر کلنٹن کا کتا چونکہ کتوں کا صدر

ہے' اس لیے اس کے نام کا انتخاب صدارتی انتخاب ہے۔ وائٹ ہاؤس کا کتا عام کتا نہیں ہوتا۔ اس کے بھونکنے کے بھی اوقات ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کی اوقات دیکھ کر بھونکتا ہے۔ امریکی صدر وائٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی جانور ضرور رکھتے ہیں تاکہ ان کو اکلاپے کا احساس نہ ہو۔ کلنٹن کی طرح بش نے بھی کتا ملی رکھا ہوا تھا۔ اسی کتے کے بارے میں صدر بش نے کہا تھا یہ کلنٹن سے زیادہ خارجہ پالیسی کا علم رکھتا ہے۔ ویسے امریکہ کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے کے لیے بندے کو ملی ہی ہونا چاہیے۔ ملی کی سوانح عمری بھی چھپی۔ یوں وہ کتا ادب کا بانی بھی تھا' بقول صدر بش ملی کی آپ بیتی اب تک سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس سے اندازہ لگالیں۔ امریکی کیسی کتابیں پڑھتے ہیں۔ وائٹ ہاؤس میں تو سگ اول گزر رہا ہو تو ملازمین یوں مودب ہو جاتے ہیں جیسے مرد اول گزر رہا ہے۔ ملی صدر بش کے بااعتماد ساتھیوں میں سے تھا' کیونکہ کتے سے بااعتماد ساتھی کون ہو سکتا ہے۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان کے مطابق اسی لیے صدر کلنٹن بھی عرصہ سے چاہ رہے تھے کہ وائٹ ہاؤس میں ان کا کم از کم ایک تو وفادار ساتھی ہو۔

امریکیوں کو اتنا اپنا شجرہ نسب معلوم نہیں ہوتا' جتنا کتے کا پتا ہوتا ہے۔ امریکہ کا ایک واقعہ ہے۔ ایک نوجوان سڑک پر واک کرتے۔ ایک سینیٹر کے پاس گیا اور کہا ”معاف کیجیے گا کیا میں آپ سے بات کر سکتا ہوں؟“ سینیٹر نے غور سے دیکھا اور کہا ”ضرور ضرور!“ نوجوان نے گھبراتے ہوئے کہا ”جناب بات یہ ہے...... میرا مطلب...... کیا آپ برا تو نہیں منائیں گے اگر میں......“ سینیٹر نے کہا ”بالکل نہیں...... میں سمجھ گیا تم میبل سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تم اس سے شادی کر سکتے ہو' مجھے امید ہے تم دونوں پُر مسرت ازدواجی زندگی بسر کرو گے۔“ شرمیلا نوجوان بولا ”کون میبل جناب؟“ وہ بولا ”میری بیٹی میبل اور کون؟ کیا تم مجھ سے میری بیٹی کا سوال نہیں کرنا چاہتے تھے؟“ شرمیلے نوجوان نے کہا ”نہیں! میں تو آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا دراصل وہ آپ کا کتا...... اگر آپ مجھے اتوار تک دے دیں تو......“ سینیٹر چلتے ہوئے بولا ”میں تمہیں اپنا نسلی

کتا کیسے دے دوں میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔“ کلنٹن نے بھی جس محنت سے الیکشن جیتا' اسی سے اپنے لیے کتے کا انتخاب کیا۔ کتا رکھنے سے امریکی صدور کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر نے مریض سے پوچھا ”میری دوا کھانے کے بعد کیا تبدیلی محسوس کی؟“ وہ بولا ”مجھ میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی' البتہ دوسروں کا رویہ میرے ساتھ بدل گیا ہے۔“ ایسے ہی امریکی صدر میں کوئی تبدیلی آئے نہ آئے' کتے کی وجہ سے لوگوں کا صدر کے ساتھ رویہ بدل جاتا ہے۔ اس سے پہلے وائٹ ہاؤس میں صرف ایک بلی ساکس تھی۔ مارک ٹوئن کے بقول بلی رکھنے سے بندہ سدھر جاتا ہے' مگر بلی بگڑ جاتی ہے۔ کتے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہے۔ کتے سرعام ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر لگتا ہے انسان کی صحبت کا کتوں پر برا اثر پڑتا ہے۔

نام رکھنا ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ چین میں پولیس' بیوروکریسی اور مردم شماری کرنے والوں کو بھی اس پریشانی کا سامنا ہے۔ وہاں چینی بچوں کے ایک سے نام ہیں۔ ادارہ شماریات کے مطابق صرف بیجنگ میں ژینگ لی نام کے 90 ہزار بچے ہیں۔ وہاں تو چند والد کے نام سے بچوں کو پہچان لیا جاتا ہے۔ امریکہ میں والد کا نام ڈھونڈنا بچے کے نام ڈھونڈنے سے بھی مشکل کام ہے۔ سو وہاں کتے کا نام ڈھونڈنا کتنا مشکل ہوگا۔ بہرحال کلنٹن نے اپنے کتے کا نام بڈی رکھا تو امریکیوں نے سکھ کا سانس لیا' البتہ ہمیں یہ نام پسند نہیں آیا۔ ہمارے خیال میں اس کا نام امریکہ رکھنا چاہیے تھا۔ دنیا میں اس نام کے کئی افراد موجود ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ دشمن ملک عراق میں بھی ایک 42 سالہ امریکہ بی بی رہتی ہے کہ محلے والے آئے دن اس کے گھر کی دیواروں پر ”امریکہ مردہ باد“ لکھ جاتے ہیں۔ امریکہ میں امریکہ نام رکھنے میں ایسی کوئی دشواری نہ تھی' لیکن اس کا نام امریکہ شاید اس لیے نہیں رکھا گیا کہ کتا تو وفا کی علامت ہے۔

شوہریت

صاحب شوہریت ایسا موضوع ہے جس پر فلمی اداکارائیں ہی بولتی اچھی لگتی ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنے ہی نہیں دوسروں کے خاوند بھی دیکھے ہوتے ہیں۔ شوہریت اور شہریت حاصل کرنا امریکہ میں ایک مسئلہ ہے۔ وہاں اس موضوع پر نت نئی تفتیشیں اور تحقیقیں ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے یونیورسٹی آف ورجینیا کے ایک ماہر نفسیات کی رپورٹ کے مطابق مرد شادی سے پہلے کم جھوٹ بولتے ہیں اور جس کی

اس نے بے حد وجوہ بتائی ہیں۔ ہمارے خیال میں تو اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ بعد میں وہ بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور ظاہر ہے صحبت کا اثر تو پڑتا ہے۔ اطالوی کہاوت ہے کہ جب بیوی گناہ کرتی ہے تو خاوند ہرگز بے گناہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جو مرد جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی بیوی کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

خاوند دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جھوٹ بولتے ہیں اور دوسرے وہ جو چپ رہتے ہیں۔ پاکستان کی عورتیں چاہتی ہیں ان کا سسرال آئیڈیل ہو۔ امریکی چاہتی ہیں خاوند، جبکہ انگریز عورتیں چاہتی ہیں ان کا بٹلر آئیڈیل ہو۔ دنیا وہ سٹیج ہے جس پر خاوند معاون اداکار کا کردار ادا کرتا ہے۔ اچھا خاوند وہ ہوتا ہے جو بیوی کو ہر وہ بات بتا دے جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود معلوم کر سکتی ہے۔ خاوند کے بیوی سے جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو کھری کھری سنانے کا نکلتا۔ خاوند اور سیاست دان سچ بولنے لگیں گے تو وہ خاوند اور سیاست دان کیسے رہیں گے؟ اگر کوئی سیاستدان کہے کہ میں نے جھوٹ بولنا ترک کر دیا ہے تو اس سے مراد یہی ہو گی کہ میں نے سیاست چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اگر کوئی خاوند ایسا کہتا ہے تو مراد ایسی ہی ہو گی۔ کہتے ہیں ایک شخص بہت جھوٹا تھا۔ پورے گاؤں میں اس وجہ سے بدنام تھا۔ ایک دفعہ وہ چلا آ رہا تھا کہ سامنے سے ایک بھدی سی ادھیڑ عمر عورت ملی اور بولی "تم وہی ہو جو بڑے جھوٹ بولتا ہے۔" تو وہ شخص یوں گویا ہوا "اے خوبرو نوجوان خاتون میں لوگوں کی زبان تو نہیں پکڑ سکتا۔" یہ سن کر وہ بولی "یہ لوگ تو ویسے ہی بدنام کر دیتے ہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں جو دوسروں کو جھوٹا کہتے ہیں وہ خود ہی جھوٹے ہوتے ہیں۔" اس سے قبل یونیورسٹی آف ورجینیا نے ہی تحقیق کی تھی کہ مرد سب سے زیادہ جھوٹ اپنی بیویوں کے ساتھ بولتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ جس کے ساتھ زیادہ بولتے ہیں۔ اسی کے ساتھ زیادہ جھوٹ بولیں گے۔ عورتیں تو کسی کے ساتھ بھی بول سکتی ہیں یہاں تک کہ آئینے کے ساتھ بھی بول بال لیتی ہیں۔ مرد خود کو صرف آئینے میں دیکھتے ہیں جبکہ عورتیں اپنا عکس ہر چمکنے والی چیز میں دیکھتی ہیں۔ وہ شیشہ ہو، چمچ ہو، ٹوسٹر ہو یا خاوند کا سر۔ وہ جھوٹ بولنے کے سلسلے میں بھی خاوندوں کی

محتاج نہیں ہوتیں' جبکہ خاوند ہوتے ہیں ویسے بھی تمام بندے جھوٹ بولتے ہیں۔ خاوندوں کو بس ذرا پہلے پتہ چل جاتا ہے۔

خاوند جتنے جھوٹ بولتے ہیں وہ سب اس لیے ہوتے ہیں تاکہ سچ سے ان کی بیوی کو تکلیف نہ پہنچے۔ پر بیویاں ان کے جھوٹ کا برا بھی نہیں مناتیں ورنہ جب کوئی خاوند اپنی بیوی سے کہتا ہے تم دنیا کی حسین عورت ہو' تم سے اچھی خاتون میں نے آج تک نہیں دیکھی تو بیوی برا نہیں مناتی۔ اگر اسے جھوٹ برا لگتا ہے تو اسے ناراض ہونا چاہیے۔

روسی ممالک میں ٹوسٹ ایک نئی صنف سخن بن کر ابھری ہے۔ جام صحت پینے سے پہلے جو کچھ بولا جاتا ہے اسے ٹوسٹ بولنا کہتے ہیں۔ ٹوسٹس کی کتابیں روسی ریاستوں میں یوں ملتی ہیں جیسے ہمارے ہاں شاعری کی۔ ان میں سے ایک معروف ادیب کا ٹوسٹ ہے "چاندنی رات تھی۔ باغ کے بنچ پر ایک مرد اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھا محبت کی باتیں کر رہا تھا۔ اگلی رات وہی وقت وہی چاندنی اور وہی بنچ تھا جس پر وہ مرد بیٹھا وہی محبت کی باتیں کر رہا تھا' لیکن آج لڑکی نئی تھی۔ تیسری رات' وہی وقت وہی چاندنی اور وہی بنچ تھا' جس پر وہی مرد بیٹھا وہی محبت کی باتیں کر رہا تھا' لیکن خاتون بدلی ہوئی تھی۔ یہ جام ان مردوں کے نام جو نہیں بدلتے اور ان عورتوں کے نام جو بدل جاتی ہیں۔" مردوں کی یہی مستقل مزاجی ہے کہ وہ بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اپنی رائے بھی۔ ویسے بھی محبت بدلنے والی چیز ہے۔ کبھی بھی بندہ اپنی غلطیوں پر نظر ثانی کر سکتا ہے' جیسے گپ شپ میں ایک خاوند نے بیوی سے پوچھا "تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" بولی "اپنی حماقت کی وجہ سے۔" خاوند یہ سن کر خوش ہو گیا تو بیوی بولی "اس میں خوش ہونے والی کیا بات ہے۔" کہا "اگر تم کہتی کہ محبت کی وجہ سے میں ناخوش ہوتا کیونکہ اکثر طلاقیں اسی لیے ہوتی ہیں کہ محبت نہیں رہتی۔ بندہ بدل جاتا ہے' لیکن حماقت تو مستقل چیز ہے۔" لگتا ہے جھوٹ بولنا بھی مستقل چیز ہے کیونکہ اس محقق ماہر نفسیات نے یہ بھی کہا ہے کہ جھوٹ بولنے والے خاوندوں کی ازدواجی زندگی سچ بولنے والوں سے کامیاب رہتی ہے۔

شوہر حاصل کرنا مکان حاصل کرنے کی طرح ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے وہ کیسا ہے بلکہ یہ کہ آپ کی مرمت وغیرہ سے وہ کیسا ہو جائے گا۔ ویسے بھی اچھی بیوی وہ نہیں جس نے ایک بہترین شخص سے شادی کی' بلکہ وہ ہے جس نے اس شخص کو بہترین بنایا جس سے شادی کی۔ شادی مرد کو سدھارنے کی کوشش کا نام ہے۔ اسی لیے گاؤں میں بڑے بوڑھے بگڑے نوجوانوں کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ ان کا بیاہ کر دیا جائے۔ بیاہ کے بعد کچھ تو سدھر جاتے ہیں اور باقی جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔ گھر کی شہریت حاصل کرنے کے لیے شوہریت ضروری ہے اور شوہریت کے لیے جھوٹ بولنا۔ شادی کے بعد عورتیں زیور اور انگوٹھیاں پہنتی ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ شادی شدہ ہیں' لیکن مردوں کو یہ کچھ نہیں کرنا پڑتا' کیونکہ انہیں دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے (مثالی شوہر وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھے جیسا وہ اپنی خوبصورت سیکرٹری کے ساتھ رکھتا ہے) ہم نے اپنے خاوند دوستوں سے کہا کہ بیوی کے ساتھ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ بولے "تم کیوں چاہتے ہو ہم اپنی بیویوں کی تعریف نہ کیا کریں؟"

جانور نامہ

صاحب یہ کالم جانوروں کے بارے میں نہیں غلام مصطفیٰ کھر صاحب کے بارے میں ہے۔ ان کا تازہ بیان ہے کہ میں اپنے فارم پر 58 بھینسوں' 30 گھوڑوں' 65 بکروں اور 13 کتوں کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اب مجھے خوش ہونے کے لیے سیاست میں آنے کی ضرورت نہیں۔

صاحب جانوروں سے مصطفیٰ کھر کے تعلق کا اسی سے اندازہ لگالیں کہ وہ

شیر پنجاب رہ چکے ہیں۔ شیر جانوروں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ پاکستان کے اخباروں کی فائلیں اٹھا کر دیکھ لیں مصطفیٰ کھر کو اتنا آدمی نہیں لکھا گیا جتنا انہیں شیر قرار دیا گیا' اسی بنا پر جب پیر پگاڑا سے کسی نے پوچھا آپ کے مصطفیٰ کھر سے کبھی تعلقات رہے؟ تو انہوں نے فرمایا ''ہم صرف اشرف المخلوقات سے تعلق رکھتے ہیں۔''

پاکستان کی سیاست میں پہلے شیروں کا راج تھا پھر زمانہ بدلا اور گھوڑے سیاست میں شیر ہوگئے۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ جتنا مہنگا ہمارا سیاست کا ایک گھوڑا بکا اتنا مہنگا کسی ڈربی ریس کا چمپئن کیا بکا ہوگا۔ یوں شیر آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے' اسی لیے آج کل مصطفیٰ کھر صاحب کو سابقہ شیر کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ سابقہ شیرنی یعنی تہمینہ کھر تو لکھتی ہیں کہ کھر قبیلے کو کھر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ ایک بار نقل مکانی کرکے اندرون پنجاب کے علاقوں کی طرف آیا تو اس نے جھونپڑیاں بنانے کے لیے گنے کے کھیتوں سے گنے کاٹ کر انہیں بانسوں کی طرح جھونپڑیوں کی چھتیں بنانے کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔ کھیتوں کے مالکوں کو پتہ چلا تو انہیں غصہ آیا' مگر جب انہوں نے گنے کا استعمال دیکھا تو کہا ''تم لوگ تو خر ہو۔'' جو بعد میں بدل کر کھر بن گیا۔ بہرحال مصطفیٰ کھر کے جانوروں کی جو لسٹ اخباروں میں چھپی ہے اس میں کھروں یا خروں کا ذکر نہیں ہے۔ اس لسٹ کو پڑھ کر ہمارے ایک مزاح نگار دوست بولے ''مجھے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی ہے کہ کھر صاحب گھوڑوں' کتوں اور بکروں کے ساتھ خوش ہیں۔'' ہم نے کہا کہ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے جانوروں سے انہیں اتنی محبت رہی ہے کہ انہیں تو جس سے محبت ہو اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس سے یہی لگتا ہے کہ اسے جانور سمجھ رہے ہیں۔ تو ہمارے دوست بولے ''حیرانی اس بات پر ہے کہ تمام جانور نر ہیں اور مصطفیٰ کھر صاحب پہلی مرتبہ نروں کے ساتھ خوش رہ رہے ہیں ورنہ وہ تو اتنے مادہ پرست تھے کہ جو مادہ نظر آجاتی اس کی پرستش کرنے لگتے۔

انہوں نے اپنے فارم پر بھینسیں تو شاید اس لیے رکھی ہوں کہ پنجاب میں بھینس اور محبت کا گہرا رشتہ ہے۔ رانجھے نے اتنا ہیر کو نہیں "چارہ" جتنا بھینسوں کو۔ پنجاب میں بھینسیں چرانے سے بندے میں رومانی جذبات اجاگر ہونے لگتے ہیں۔ سو ممکن ہے کھر نے بھینسیں اس لیے رکھی ہوں کہ رومانوں کی ریہرسل ہوتی رہے' جہاں تک گھوڑوں کا تعلق ہے تو سیاست میں گھوڑوں کی ہمیشہ ڈیمانڈ رہی ہے۔ سیاسی گھوڑے تو کھر صاحب کو دولتیاں جھاڑ گئے۔ اب وہ ان گھوڑوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ بھینسیں انہیں بیتی محبتیں اور گھوڑے سیاست یاد دلاتے ہوں گے۔ کتے کیا یاد دلاتے ہیں' یہ ہمیں یاد نہیں آ رہا۔

کتا ایک وفادار جانور ہے۔ پتہ نہیں ہم ساری اچھی خوبیاں جانوروں میں ہی تلاش کیوں کرتے ہیں؟ بندہ برا لگے تو اسے کتا کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ب ہو کہ آج کل کے زمانے میں وفا کی یہی قدر ہے۔ بہرحال کھر صاحب کے ک ان کی طرح شکاری ہیں۔ وہ ان کتوں کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ ان کے سامنے اپنے ملازموں کو نہیں ڈانٹتے تاکہ کتوں کی نفسیات پر برا اثر نہ پڑے۔ فرانسیسی ساحرہ برجی باردت کہتی ہے "میں نے اپنی جوانی اور خوبصورتی انسانو پر ضائع کر دی' جبکہ اپنی دانش اور تجربہ جانوروں کی نذر کر رہی ہوں۔" کچ معاملہ مصطفیٰ کھر صاحب کا ہے۔ انہوں نے جوانی بستر میں گزار دی۔ اب بڑھ جانوروں میں گزار رہے ہیں۔

مغرب میں تو جانوروں کے حقوق کی اس قدر جنگ ہو رہی ہے کہ ای جانوروں سے محبت کرنے والے ایک شخص کا مطالبہ ہے کہ جانوروں کو ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیے ہو سکتا ہے وہ دلیل میں یہ کہے کہ اگر ہاتھی اور گدھ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ امریکی صدر کون ہوگا تو دوسرے جانوروں کو اس سے باہر کیوں رکھا جاتا ہے؟ پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق جنرل سیکرٹری شیخ ر صاحب نے ایک بار اپنے کتے کے حوالے سے کہا تھا کہ اگر میرے کتے کا وو ہوتا تو وہ مجھے ہی ووٹ ڈالتا۔ سچی بات ہے شیخ صاحب اپنے ہی نہیں ہمارے

کے ووٹ کے بھی حقیقی حقدار ہیں' لیکن مصطفیٰ کھر صاحب نے تاحال جانوروں کے ووٹوں کی بات نہیں کی۔ ممکن ہے جیسے کوٹ ادو سے لوگوں نے کھر صاحب کا کوٹ اتار دیا ہے' ایسے ہی کھر صاحب کو ڈر ہو کہ جانور بھی مجھے ووٹ نہ دیں گے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ان کے جانور ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو کھر صاحب انسانوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ انہیں اگر ووٹ کا حق ملا تو کھر صاحب کو ہی اپنا نمائندہ چنیں گے' کیونکہ جانور انسانوں کی طرح بے وفا تھوڑے ہوتے ہیں۔

خلیفہ جی

ہم سمجھتے ہیں داڑھی چہرے کا حجاب ہے‘ عورتیں پردے میں منہ چھپاتی ہیں اور مرد داڑھی میں۔ طالبان نے تو حکم دے رکھا ہے کہ جو سرکاری ملازم داڑھی کے بغیر نظر آئے اسے ملازمت سے نکال دیا جائے۔ یوں وہاں داڑھی دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ دوسرا کتنا سرکاری ہے۔ ہمارے ہاں بھی جب سے ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ کہا ہے کہ اگر نواز شریف داڑھی رکھ لیں تو وہ ”خلافت“ کے لیے کوالیفائی کرتے ہیں تب سے

نواز شریف کی بجائے آصف زرداری داڑھی رکھنے کا سوچ رہے ہیں۔ ویسے آصف زرداری کے ”خلیفہ“ بننے میں یہی کسر رہ گئی ہے۔

خوشی اس عینک کی طرح ہے جسے ایک بڑھیا بڑی دیر تک تلاش کرتی رہی اور آخر اسے وہ اپنی آنکھوں پر لگی ہوئی ملی۔ ہمیں بھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس بڑھیا کی طرح ہی لگے کیونکہ وہ ایک عرصہ سے خلیفہ کی تلاش میں تھے۔ ان کے بار بار بیان چھپتے کہ وہ ملک میں خلافت کا نظام لانا چاہتے ہیں جس کے لیے انہوں نے مکمل تیاریاں کرلی ہیں۔ بس انہیں خلیفہ نہیں مل رہا۔ ہم نے ان کے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا مولانا کے ہاں شیشہ نہیں ہے جو انہیں خلیفہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اسراروں سے اتنے واقف نہیں ہیں۔ یہی پتہ ہے کہ انہیں ”اقتدار“ اور ”اظہار“ سے بہت محبت ہے۔ وہ بڑے عالم دین ہیں‘ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹے عالم دین ہوتے نہیں ہیں۔ وہ ساری ساری رات قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے انہیں قرآن کے قوال کہا ہے‘ لیکن ہم انہیں کچھ نہیں کہتے جو کہنا ہوتا ہے وہی کہتے ہیں۔ ہماری مثال تو اس کرنل کی سی ہے جس نے جیل کے دنوں میں فیض احمد فیض صاحب سے درس قرآن لینا شروع کیا۔ ایک دن وہ کرنل فیض احمد فیض صاحب کے پاس آکر پوچھنے لگا ”آپ کا مذہب کیا ہے؟“ فیض صاحب نے اسے کہا ”وہی جو مولانا روم کا تھا“ کرنل مولانا روم کا نام سن کر چپ ہو گیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا ”اچھا تو آپ ہمارے مسلمان بھائی ہوئے ناں“ جیل سے رہائی کے برسوں بعد کرنل کی پھر فیض احمد فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فیض صاحب بتاتے ہیں اسے میرے مذہب نے پھر اکسایا اور وہ پوچھنے لگا ”فیض صاحب مولانا روم کا مذہب کیا تھا؟“ فیض صاحب نے کہا ”جو میرا ہے۔“

ڈاکٹر اسرار احمد کے انٹرویوز ہم اس لیے نہیں پڑھتے کہ ہماری ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بڑی اچھی رائے ہے جسے ہم رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ہم فخر زمان صاحب کو بڑا ادیب سمجھتے تھے‘ لیکن پھر ایک روز ہم نے ان کی ایک کتاب

پڑھ لی۔ سو ہم کوشش کرتے ہیں کہ اسرار صاحب کے انٹرویوز نہ پڑھیں لیکن سرخی اخبار کے چہرے پر کیوں نہ ہو ہمیں متوجہ ضرور کرتی ہے۔ سوان کے تازہ انٹرویو کی ذیلی سرخی تھی ''کشمیر کا جہاد ادنیٰ درجے کا ہے۔'' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر وقت ایسی ہی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کی گفتگو بھی فرماتے ہیں جیسے انہوں نے فرمایا ہے کہ مجھے ابھی تک ٹائی لگانے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے وہ ٹائی کا فائدہ اٹھانا ہی نہ چاہتے ہیں۔ ٹائی کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ جب اسے اتارو تو بڑا سکون ملتا ہے۔ بہر حال انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے خلیفہ تلاش کرلیا ہے۔ سچی بات ہے جتنی لگن سے ڈاکٹر اسرار احمد نے خلیفہ تلاش کیا ہے اتنی لگن سے تو کولمبس نے امریکہ دریافت نہ کیا۔ کم از کم امریکہ خود چل کر کولمبس کے پاس خود کو دریافت کروانے تو نہ گیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد ایم بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ جب وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے تو کالج کینٹین پر ہی پائے جاتے کیونکہ کینٹین کالج کا دارالخلافہ ہوتی ہے اور یہاں بڑے بڑے خلیفے پائے جاتے ہیں۔ نواز شریف وزیراعظم بننے کے بعد جب اپنے والد محترم کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو ملنے گئے تو یکدم نواز شریف صاحب کو دیکھ کر انہیں پتہ چلا کہ جس خلیفہ کی انہیں تلاش ہے وہ تو یہی ہے بس داڑھی کی کمی ہے۔ ویسے نواز شریف صاحب کا چہرہ بڑا معصوم سا ہے۔ اس پر داڑھی بہت سجے گی۔ بینظیر دور میں تو ایک نجومی نے اعلان کیا تھا کہ اگر نواز شریف صاحب داڑھی رکھ لیں تو ان کا ستارہ عروج پر جاسکتا ہے بلکہ انہوں نے تو نواز شریف صاحب کی خیالی داڑھی والی تصویر بھی شائع کی تھی جس میں ان کا نورانی چہرہ اور پیشانی چمک رہی تھی۔ اگرچہ پیشانی کی چمک کی وجہ کچھ لوگ کچھ بتاتے ہیں' کیونکہ نواز شریف وسیع قلب ہی نہیں پیشانی بھی ایسی ہی رکھتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتاہ پیشانی کہاں ختم ہوئی اور پریشانی کہاں سے شروع ہوئی۔ ہم ڈاکٹر اسرار احمد کے دماغ کو قومی خزانہ سمجھتے ہیں۔ یاد رہے ہم یہ تب سے سمجھ رہے ہیں جب ابھی قومی خزانے کی حالت ایسی نہ تھی جیسی اب ہے۔ بہر حال ہمارے خیال میں ان کی طرف سے

نواز شریف کو اس قابل سمجھنا قابل ذکر بات ہے۔ ہم نواز شریف کو خلیفہ کاسٹ ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں' لیکن آصف زرداری صاحب کو بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے وہ بھی جلدی جلدی داڑھی بڑھوا کر ڈاکٹر اسرار احمد کو منہ دکھائیں پھر زرداری صاحب کا خلیفہ بننے کا پہلے سے تجربہ بھی ہے۔ ہمارے ہاں خلیفہ جی وہ ہوتا ہے جس کے آگے سب سر جھکائیں تاکہ وہ ان کی ''حجامت'' کرسکے۔ آصف زرداری نے بے نظیر حکومت میں تین سال یہی کام کیا۔ ہماری گزارش ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نواز شریف کو خلیفہ کاسٹ کرنے سے پہلے ایک بار آصف زرداری کا آڈیشن ضرور کرلیں۔

فارغ البالیاں

ادب واحد شعبہ ہے جس میں نقاد کو باعزت مقام ملتا ہے۔ سیاست اور حکومت چونکہ ادب نہیں اس لیے وہاں نقاد کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے جو ادب میں نقاد لکھنے والوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے باوجود حکومت کے نقادوں کی تعداد ادب کے نقادوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ آج کل حکومت کے اکثر نقاد یہ شور مچا رہے ہیں کہ موجودہ حکومت لوگوں کے مسائل حل کرنے میں سنجیدہ نہیں، حالانکہ موجود

حکومت تو بڑی سنجیدہ ہے۔ بس نواز شریف صاحب کو دیکھ کر اس کی ہنسی نکال جاتی ہے، کیونکہ نواز شریف دیکھنے میں ایسے ہیں کہ کالج میں ان کے استاد مشکور حسین یاد نے ایک بار کلاس میں انہیں کھڑا کر کے پوچھا "تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟" تو نواز شریف نے کہا "سر میں ہنس تو نہیں رہا، میری شکل ہی ایسی ہے۔" حکومت نے موٹر سائیکل پر ڈبل سواری پر پابندی لگا کر ملک میں فوری طور پر ملک سے نصف جرائم کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ملک میں چونکہ امن وامان ہو چکا ہے، سو حکومت اپنی توجہ لوگوں کو "فارغ البال" بنانے کی طرف مبذول کر رہی ہے۔ پہلے مرحلے میں ساہیوال کے نوجوانوں کو فارغ البال بنانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ساہیوال کے سٹی مجسٹریٹ سکندر بخاری صاحب نے اپنے علاقے میں اس کا افتتاح کیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق نوجوانوں کو فوری طور پر "فارغ البال" بنانے کے لیے حجاموں کی ایک چار رکنی ٹیم تشکیل دی گئی ہے۔ اس مہم میں جس نوجوان کے بال لمبے نظر آئیں گے۔ اس کو پکڑ کر اس کی ٹنڈ کر دی جائے گی۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ سب اخلاقی بے راہ روی ختم کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جب طالبان نے افغانستان میں مردوں کو سر پر ٹوپیاں پہننے کا حکم دیا تھا تو لوگوں نے اس سے بھی یہی نتیجہ نکالا تھا، حالانکہ طالبان نے یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ برسوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے افغانیوں کے پاس سر چھپانے کو کچھ نہ بچا تھا۔ طالبان نے ٹوپیاں پہننے کا حکم اس لیے جاری کیا تاکہ کوئی حکومت سے یہ نہ کہہ سکے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو کچھ بھی نہیں۔ سو مردوں کے لمبے بال کاٹنے سے بے راہ روی میں کمی کرنے کا حکومت کا کوئی ارادہ نہیں۔ ویسے بھی ٹنڈ کرنے سے سر ننگے ہو جائیں گے اور ننگا پن زیادہ بے راہ روی پھیلاتا ہے۔

ہم ساہیوال کے سٹی مجسٹریٹ سکندر بخاری صاحب کو تو نہیں جانتے، لیکن ہمارا خیال ہے وہ مسلم لیگ نواز شریف گروپ سے تعلق رکھتے ہوں گے اور لوگوں کی ٹنڈیں کروا کے اپنے لیڈر سے یکجہتی کا اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ساہیوال میں لڑکوں میں لمبے بال رکھنے کا رواج ہو چکا تھا۔ وہ جا رہے ہوتے تو لگتا بے نظیر جا رہی ہیں۔ سو سکندر بخاری صاحب کے اس آپریشن کلینگ سے وہ جاتے ہوئے

دازشریف لگیں گے۔ ہیئر سٹائلز حکومت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی بے نظیر سٹائل آتا ہے اور کبھی

لیلیٰ نظر آتا ہے، مجنوں نظر آتی ہے

کراچی کے شاعر جون ایلیا اسی سٹائل کے نمائندہ ہیں۔ ایک لڑکے نے کہا "میں جون ایلیا صاحب سے ملا" تو دوسرے نے پوچھا "کہاں تھے؟" تو پہلا بولا "میں نے ان کے بالوں کو ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ہٹایا تو اندر وہ تھے۔" کہتے ہیں ایک بار وہ ڈاکٹر کے پاس گئے کہ چکر بہت آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد انہیں کہا "یہ دوائی ہے صبح دوپہر شام پانی کے ساتھ استعمال کریں۔" اور صابن کی ٹکیاں ان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

ممکن ہے سٹی مجسٹریٹ صاحب نوجوانوں کا "گنج" اس لیے کرنا چاہ رہے ہوں کہ گنج خزانے کو کہتے ہیں۔ لگتا ہے یہ بات وزیر خزانہ سرتاج عزیز کو دیکھ کر کہی گئی ہوگی۔ اگرچہ وہ سرتاج بھی ہیں اور عزیز بھی۔ ویسے ان سے پوچھا جائے کہ میں کنگھی کرتا ہوں "کون سا فعل ہے؟" تو کہیں گے "فعل ماضی" سرتاج صاحب اپنے حجام کو حجامت کے بہت پیسے دیتے ہیں۔ کسی نے ان کے حجام سے پوچھا "سرتاج عزیز آپ کو اتنے پیسے بال کاٹنے کے دیتے ہیں؟" تو اس نے کہا "نہیں بال ڈھونڈنے کے۔"

ممکن ہے جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ بال کشی کی مہم علاقے سے بے راہ روی ختم کرنے کے لیے چلائی جا رہی ہے وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، کیونکہ ہماری اردو شاعری میں آدھی بے راہ روی لمبی زلفوں کی وجہ سے ہے۔ یہ زلفیں کتنی خطرناک ہوں گی کہ شاعروں نے ہمیشہ انہیں ناگن کہہ کے پکارا، لیکن یہ ہمیشہ خواتین کی زلفوں کے بارے میں کہا گیا۔ مردانہ زلفوں سے مراد تو بھٹو مرحوم بھی ٹنڈ ہی لیا کرتے تھے۔ جیمز ویل نے کہا تھا عورت کے ایک بال میں کھینچنے کی جتنی صلاحیت ہوتی ہے اتنی سینکڑوں بیلوں کی جوڑیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ ان زلفوں کے اکثر لوگ اسیر ہو جاتے ہیں۔ بال سر کا لباس ہوتے ہیں، اس لیے مرد تک اپنی ٹنڈیوں ڈھانپتے ہیں جیسے ستر ڈھانپ رہے ہیں۔ وگ تو سر کی شلوار ہے۔ اگرچہ ہمارے خیال میں گنجا وہ ہوتا ہے جو اتنا سربلند ہو کہ اس کا سر بالوں سے اوپر نکل آئے۔ اصل گنجا سر وہ ہوتا ہے جس پر ہاتھ

پھیرا جائے تو لگے ہاتھ پر سر پھیرا جا رہا ہے۔

پنجاب کے دیہاتوں میں آج بھی کوئی نوجوان بال بڑھا لے تو بڑھے بوڑھے بُرا مناتے ہیں اور زبردستی اس کی "حجامت" کر دیتے ہیں۔ تحقیق کے بعد اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ ان کی نظریں کمزور ہوتی ہیں اور انہوں نے لمبے بال دیکھ کر اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کوئی آیا ہے یا آئی ہے۔ سو وہ اپنے فائدے کے لیے لڑکوں کے بال چھوٹے کروا کے رکھتے ہیں تاکہ مغالطے کی وجہ سے بے راہ روی نہ پھیلے۔ سو یہ بھی ممکن ہے جو ٹارگٹ سکندر بخاری صاحب آپریشن ٹنڈ کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اپنی عینک کا نمبر ٹھیک کروا کے حاصل کر لیں اور سارے علاقے کو "فارغ البال" بنانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

پی ٹی وی (پاکستان ٹریجڈی ویژن)

ساتویں قومی فلم ایوارڈز کی جیوری کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے کہا تھا جیوری کے لیے ایوارڈ کا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا' اس لیے نہیں کہ فلمیں بہت اچھی تھیں' اس لیے کہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ سب سے کم بُری فلم کون سی ہے؟" ہم نے اس پر تجویز دی تھی کہ فلم ایوارڈز کی جیوری کو چاہیے کہ اگلے سال سے فلم بنانے والوں کے ساتھ ساتھ فلم دیکھنے والوں کو بھی ایوارڈز دیئے جائیں۔ اب تو پی ٹی وی دیکھنا بھی

چھوٹی بات نہیں رہا۔ ایسے پروگرام ہوتے ہیں کہ اچھا خاصا ہنستا کھیلتا شخص گھڑی ٹی وی دیکھ لے تو شکل سے شادی شدہ لگنے لگتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پی ٹی وی پر کامیڈی پروگرام نہیں ہوتے' کیونکہ ہم خبرنامہ دیکھتے ہیں۔ اس کا دورانیہ بھی اتنا ہی ہے جتنا پوری دنیا میں کامیڈی پروگرامز کا ہوتا ہے پھر اس کی کاسٹ بھی اے ون ہوتی ہے۔ پچھلے دور حکومت میں ایک تعزیت پر نواز شریف نے ایک بچے سے پوچھا "بیٹا بتاؤ بھلا میں کون ہوں؟" وہ بڑی معصومیت سے بولا "آپ وہی ہیں ناں جو نو بجے والے ڈرامے میں آتے ہیں۔" ان حالات میں تو اب پی ٹی وی ایوارڈز پر پی ٹی وی دیکھنے والوں کا حق زیادہ بنتا ہے۔ بابرہ شریف کی فلم دیکھ کر ایک چینی نے کہا تھا "یہ چھوٹی سی اداکارہ پاکستان کی سب سے بڑی اداکارہ ہے۔" ایسے ہی ہماری یہ چھوٹی سکرین کبھی بہت بڑی تھی' لیکن اب ڈش پر دنیا میں سب سے کم دیکھے جانے والے چینلز میں برما' چائینہ اور پاکستان میں مقابلہ ہے۔ پہلے ہمارے ڈراموں کی وجہ سے ٹی وی بکتے تھے۔ اب بھی بکتے ہیں' لیکن ایسے ہی جیسے باب ہوپ نے کہا تھا "ایک ماہ قبل ٹی وی پر میں نے شو کیا۔ اگلے ہی دن پانچ ملین ٹی وی بک گئے' جن کے نہ بکے انہوں نے پھینک دیئے۔" اصغر خان صاحب جتنی محنت سے ہارتے ہیں اس سے کم محنت پر جیتا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی پی ٹی وی جتنی محنت سے پروگرام بناتا ہے' اس سے کم محنت پر اچھے پروگرام بنا سکتا ہے۔ یاد رہے پہلے اچھا پروگرام وہ کہلاتا تھا جسے عوام پسند کرتی تھی۔ اب جو حکمرانوں کو پسند ہو۔ لاہور ٹی وی کے ایک جنرل منیجر سے پوچھا گیا "آپ کو کتنا سٹاف دیا جائے تو آپ پروگراموں کا معیار بہتر بنا سکتے ہیں؟" تو وہ بولے "جتنا موجود ہے اسے آدھا کر دیں۔" پوچھا "اگر معیار مزید بہتر بنانا ہو؟" تو وہ بولے "میرا سٹاف مزید کم کر دیں۔" پی ٹی وی کے پاس بڑے بڑے لائق آفیسرز ہیں۔ ان جیسے ایک لائق پروفیسر کی تعریف کرتے ہوئے کسی نے لکھا تھا "وہ اتنے لائق ہیں کہ ان کا بنایا ہوا ایف اے کا گیس بی اے میں بھی چل سکتا ہے۔ ٹی وی ہیڈ کوارٹر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ہیڈ بس کوارٹر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں کی ایک میٹنگ کا سچا واقعہ ہے۔ ایک افسر نے کہا "فلاں پروگرام بہت گھٹیا ہے۔ میری بیوی کہہ رہی تھی اسے بند کر دینا چاہیے۔" دوسرے افسر سے پوچھا گیا کہ آپ کی اس پروگرام

کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ بولا "میں آپ سے متفق ہوں میری بیوی بھی یہی کہہ رہی تھی۔" تیسرے افسر سے پوچھا گیا تو وہ بولا "میری بیوی کو بھی یہ پسند نہیں آیا۔" چوتھے افسر سے پروگرام کے بارے میں رائے پوچھی گئی تو وہ بولا "میں اس پروگرام پر کوئی رائے نہیں دے سکتا' کیونکہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

ٹی وی حکومت کا چہرہ ہوتا ہے۔ رعنا شیخ جب ایم ڈی تھیں تو ایم ڈی سے مراد مینجنگ ڈانسرز تھا۔ ان دنوں ہم نے ایک ٹی وی پروڈیوسر سے پوچھا "یہ جو کلچر دکھایا جارہا ہے یہ کہاں ملتا ہے؟" بولا "ہر گھر میں" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "ہر گھر میں سے مراد؟" بولے یہاں "ہر" انگریزی کا ہے۔" ٹی وی دیکھ کر پتہ چل جاتا کہ پی ڈی ایف یعنی پاکستان ڈانسنگ فرنٹ کی حکومت ہے' لیکن آج کل ٹی وی حکومت کا جو چہرہ دکھاتا ہے' اس سے حکومت بیمار بیمار لگتی ہے۔ ٹی وی کے بیمار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو پی ٹی وی کے چیئرمین پرویز رشید صاحب نے دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے "پی ٹی وی کے صرف میڈیکل بل تقریباً آٹھ کروڑ کے ہیں۔"

اُلّو باٹے

ملک کی سیاسی صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ اب تو پیر پگاڑو بھی بولنے لگے ہیں۔ ہم نے ایک دوست سے کہا کہ وہ زمانہ گیا جب پاک ٹی ہاؤس میں ادبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے ادیب گفتگو کرتے تھے۔ اب تو وہاں اُلّو بولتے ہیں۔ اس نے ہماری بات کا اعتبار نہ کیا۔ ایک دن پاک ٹی ہاؤس میں نقادوں کی گفتگو سن کر آیا اور بولا تم ٹھیک کہتے تھے۔ لیکن پیر پگاڑو صاحب کا بولنا نواز شریف کی چپ سے زیادہ پُراسرار

ہو تا ہے وہ ہمارے گفتار کے غازی ہیں۔ اگرچہ جب سے قاضی حسین احمد سیاست میں آئے ہیں تب سے گفتار کے غازی کی جگہ محاورہ گفتار کے قاضی ہو گیا ہے۔ پیر پگاڑو جب بھی بولتے ہیں ان کی گفتگو سننے سے پہلے ہی ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی ڈرانے والی بات ہی ہو گی۔ جیسے سر تاج عزیز صاحب جب بھی پریس کانفرنس کرنے لگیں روپیہ ڈر جاتا ہے کہ یہ اپنے ساتھ میری ویلیو بھی کم کریں گے۔ ایک زمانے میں جب پوسٹ کارڈ بھیجنے کا رواج تھا تو بُری خبر والے پوسٹ کارڈ کا کونہ پھٹا ہو تا یہ گاؤں میں خواندگی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اسمبلی میں ہوتی ہے۔ سو اس سے پہلے کہ گاؤں کا سکول ماسٹر آ کے خط پڑھ کر سناتا' خط یا پوسٹ کارڈ کا کونہ پھٹا دیکھ کر عورتیں احتیاطاً بین کرنے شروع کر دیتیں۔ پگاڑو صاحب نے بھی احتیاطاً بیان بازی شروع کر دی ہے کہ نواز شریف کے بعد نیا وزیر اعظم وہ بنے گا جس کے سر پر اُلّو بیٹھے گا اور اُلّو اس سر پر بیٹھے گا جس کے سر پر بال نہ ہوں گے۔

پاکستان کا وزیر اعظم بننے کے لیے پیر صاحب اکثر مشکل شرائط کا اعلان ہی کرتے ہیں۔ جیسے انہوں نے عمران خان کے حوالے سے کہا کہ عمران خان اس دن وزیر اعظم بنے گا جب مرغی بانگ دے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمران خان کے چاہنے والے بانگ دینے والی مرغیوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمران خان سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی طرف۔ پیر صاحب عرصہ سے چپ تھے۔ جب پیر صاحب چپ ہوں اس کا مطلب ہے سب خیر ہے۔ جب بولتے ہیں تو مطلب وہی ہوتا ہے جو ڈاکٹر اور بیوی کی چپ کا ہو تا ہے۔ جب سے انہوں نے کہا ہے اقتدار کا اُلّو اس سر پر بیٹھے گا جس پر بال نہ ہوں گے' تب سے ہم سیاستدانوں کے سروں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ گویا بال لیڈروں کے لیے وبال بن گئے ہیں۔ اس سے پہلے اُلّو کی جگہ اور پرندہ اقتدار دینے کے لیے مامور تھا۔ اس کا نام ہما تھا۔ ہم آج تک یہ نہیں جان سکے کہ ہما سروں پر ہی کیوں بیٹھتا ہے۔ اسے بیٹھنے کے لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں ملتی۔ پھر پیر صاحب کا سر اسے کیوں نظر نہیں آتا۔ بہرحال ممکن ہے اسی بنا پر پیر صاحب نے پرندہ بدل دیا ہو۔ امریکہ اور الو کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم نے جسے بے وقوف کہنا ہو اسے الو کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے ایسے لیڈر ہیں جو کئی کئی الوؤں پر بھاری ہیں۔ گوجرانوالہ کے ہمارے ایک امیدوار حاجی گلو کے الیکشن کے دوران محلے والوں نے نعرہ لگایا "سو گلو اک الو" گلو صاحب اس پر ناراض ہوئے۔ کسی نے کہا "امریکہ میں الو عقلمندی کی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سو آپ جیسے مل کر ایک الو جتنے عقلمند بنتے ہیں۔" تو گلو صاحب بولے "پھر یہ نعرہ غلط ہے یہ نعرہ لگوائیں "ایک گلو سو الو" بہرحال امریکہ اور الو کو کون بے وقوف کہہ سکتا ہے۔ پھر اب اگر وزیر اعظم کا انتخاب انہوں نے کرنا ہے اور وہ بھی سر دیکھ کر تو پھر ہم سر نگوں ہونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

گنج پچھلے چند سالوں سے اقتدار کی علامت بن گیا ہے۔ روس کے الیکشن کے دنوں میں بھی ایک رپورٹ چھپی کہ اس بار وہ روسی صدر بنے گا جس کے سر پر بال نہ ہوں گے۔ گویا صرف ہمارے ہاں ہی حکمران بننے کے لیے "گنج" نہیں چاہیے۔ ویسے تو عوام کے سر گننے کے لیے ہوتے ہیں اور حکمرانوں کے بالوں کے لیے۔ ہو سکتا ہے پیر پگاڑو کے اس بیان کے بعد گنجے رہنما سر اٹھانے لگیں۔ اس سے پہلے وہ اپنا "گنج" ٹوپی اور ٹیکس سے چھپا کر رکھتے۔ الیکشن سے پہلے ایک رہنما نے کہا "اس بار ہماری پارٹی دیانت دار امیدوار کھڑا کرے گی۔" تو ایک صحافی بولا "میں نے تو سنا تھا اس بار آپ کھڑے ہو رہے ہیں۔" بہرحال پیر پگاڑو صاحب کی سر کے بال نہ ہونے کی شرط عورتوں کے خلاف سازش لگتی ہے' البتہ اگر فیصلہ صرف الو نے کرنا ہے تو وہ گنج پر ہی بیٹھے گا۔ ایک خاتون سے دوسری نے پوچھا "دنیا کا سب سے ویران اور غیر آباد خطہ کہاں واقع ہے؟" تو دوسری خاتون بولی "میرے خاوند کی ٹوپی کے نیچے۔" الو کو چونکہ ویرانی اور بیابانی اچھی لگتی ہے' اس لیے وہ ایسا سر ہی پسند کرے گا۔ ہمارے ذہن میں بڑے بڑے سر آ رہے ہیں' ان سروں میں میاں اظہر' اسحاق ڈار اور اعجاز الحق کے سر نہیں ہیں اور انہیں گنجوں سے محتاط رہنا چاہیے کیونکہ گنجوں کا کوئی بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔

تنگ آمد

صاحب زنانہ پولیس اور مردانہ پولیس میں وہی فرق ہے جو عورت اور مرد میں ہے۔ عورت اور مرد میں تو اتنا فرق ہے کہ ہم نے ایک دوست سے پوچھا ''قیام پاکستان کے دن جنم لینے والے اب کتنی عمر کے ہوں گے؟'' بولا اس پر منحصر ہے کہ وہ عورت ہے یا مرد۔ بلکہ عورت اور مرد ایک ہی بات کہیں تو مراد ایک نہ ہو گی۔ جیسے اگر مرد کہے کہ وہ باہر جانے کے لیے تیار ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ باہر

جانے کے لیے تیار ہے اور جب عورت کہے کہ وہ تیار ہے تو اس کا مطلب ہے وہ جونہی بُندے ڈھونڈ لے گی اور میک اپ ختم کر لے گی' وہ تیار ہے۔ ڈیل کارنیگی کہتا ہے ''اگر کوئی مرد عورت دوسرے مرد عورت سے راستے میں ملے تو عورت کی نظر مرد پر نہیں جائے گی بلکہ وہ یہ دیکھے گی کہ دوسری عورت نے کیا کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' اس کے باوجود جب زنانہ تھانے بنے تو ہم نے لکھا کہ اس سے جرائم میں کمی ہو گی۔ زنانہ تھانوں کے قیام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق مل گئے۔ ظاہر ہے اگر مرد مجرموں کے لیے تھانے ہیں تو عورتوں کے تھانہ نہ ہونا ان کی حق تلفی ہے۔ ہو سکتا ہے بہت سی خواتین صرف زنانہ تھانے کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے جرم نہ کر سکتی ہوں۔ عورتوں کو سزا کے لیے الگ تھانوں میں رکھنا چاہیے' لیکن لاہور کے زنانہ تھانے کی انچارج کا بیان پڑھ کر لگا کہ زنانہ تھانے کے عملے کو بھی یہاں اسی لیے رکھا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پولیس لوگوں کو تنگ نہیں کرتی۔ لوگ پولیس کو تنگ کرتے ہیں۔ اس سے لگتا ہے زنانہ تھانے بنائے ہی یہ ثابت کرنے کے لیے ہیں کہ صرف پولیس ہی لوگوں کو تنگ نہیں کرتی۔ ویسے پولیس والے اتنے مجرموں سے تنگ نہیں ہوتے جتنے اپنی وردی سے' جو ہر دھلائی پر اور تنگ کرتی ہے۔ پیٹ اور پیٹی کے بغیر پولیس والا ہونا ایسے ہی ہے جیسے بغیر داڑھی کے مولوی ہونا' البتہ زنانہ تھانوں میں ایسا نہیں کیونکہ وہاں باآسانی میٹرنٹی لیو مل جاتی ہے۔ زنانہ پولیس اپنی سمارٹنس کا ہی خیال نہیں رکھتی بلکہ مجرموں کو پکڑنے کے بھی بڑے سمارٹ طریقے استعمال کرتی ہے۔ جیسے پچھلے دنوں زنانہ تھانوں میں دست شناسی کی ٹریننگ دی گئی تاکہ وہ ہاتھ دیکھ کر مجرم کو پہچان لیں۔ کہا گیا چونکہ قاتل کے ہاتھ کی لکیریں دوسروں سے مختلف ہوتی ہیں' اس لیے اگر زنانہ پولیس کو پامسٹری آتی ہو گی تو انہیں قاتل اور دہشت گرد پکڑنے میں چنداں دشواری نہ ہو گی۔ ہمیں تو یہ مجرموں کے ساتھ بے جا رعایت لگتی ہے کہ وہ مفت میں پولیس والوں کو ہاتھ دکھا سکیں گے۔ البتہ یہ ہے کہ جو ڈاکو اور قاتل زنانہ پولیس کو ہاتھ دکھانے پر رضامند نہ ہوں انہیں کیسے تیار کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے

مردانہ پولیس قاتلوں‘ دہشت گردوں کو پکڑ کر زنانہ پولیس کے پاس لائے اور زنانہ پولیس ان کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر فیصلہ کر لے کہ انہیں پکڑنا ہے یا نہیں۔ ہم مردانہ پولیس کی صلاحیتوں کے پہلے ہی معترف ہیں‘ بالخصوص ان کے سونگھنے کی حس کے۔ وہ منہ سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ پی ہے یا نہیں۔ اگرچہ یہ کوئی مشکل نہیں۔ نذیر ناجی صاحب کا کالم سونگھ کر یہ بتایا جاسکتا ہے۔ آج کل ڈاکوؤں اور قاتلوں کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے ممکن ہے وہ زنانہ پولیس کو ہاتھ دکھانے نہ آئیں۔ سو زنانہ پولیس کو اس طریقہ کار کی پریکٹس کے لیے مردانہ پولیس کے ہاتھ دیکھتے رہنا چاہیے کیونکہ پولیس اور مجرموں کا اتنا پرانا ساتھ ہے کہ اب تو ان کے ہاتھوں کی لکیریں بھی ملنے لگی ہیں۔ زنانہ پولیس سے دہشت گرد برقعوں میں بھی نہ چھپ سکیں گے۔ پتہ چلا ہے کچھ دہشت گرد برقعوں میں بھی وارداتیں کر رہے ہیں جس کی تصدیق ہمارے ایک شاعر دوست نے کی۔ اس نے کہا ”میری بیوی جب بھی برقعہ اتارتی ہے‘ اندر سے ایک دہشت گرد نکلتا ہے۔“

خواتین ویسے بھی مردوں سے بہتر منتظم ہوتی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ زنانہ تھانے میں ایک ملزمہ کو دیکھ کر خاتون کانسٹیبل نے انسپکٹر سے کہا ”باجی یہ وہی ہے جس نے پچھلی بار بڑے بڑے جھمکے پہن رکھے تھے۔“ عجائب گھر میں چوری ہو گئی۔ منتظم خاتون نے زنانہ پولیس منگوائی‘ جس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ منتظم نے پوچھا ”آپ عجائب گھر کا معائنہ کر چکی ہیں‘ آپ میں سے کسی کو کسی چیز کے بارے میں معلومات درکار ہوں تو پوچھ لیں؟“ لیڈی انسپکٹر بولی ”آپ عجائب گھر کے فرش کو چمکانے کے لیے کون سی پالش استعمال کرتی ہیں۔“ زنانہ پولیس کی وجہ سے لوگ پولیس سے ڈرنا کم ہوئے ہیں۔ وہ لفنگے جو پہلے تھانے والی سڑک چھوڑ کر گزرا کرتے تھے‘ اب تھانے والی سڑک سے ہی گزرتے رہتے ہیں۔ سو زنانہ تھانوں کی حفاظت کے لیے مردانہ پولیس کی ڈیوٹی لگانا پڑی۔ ویسے یہ ہے کہ زنانہ تھانہ بننے سے علاقے میں جرائم کم ہو جاتے ہیں‘ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مردانہ پولیس تو سارا دن زنانہ تھانے کی حفاظت میں لگی رہتی ہے۔

ہیئر فورس

افغانستان کی ایئر فورس نے 50 سالوں میں کیا کارنامے انجام دیئے ہوں گے جو وہاں کی ہیئر فورس نے 50 دنوں میں دے دیئے ہیں۔ اگرچہ ایئر فورس بھی سربلندی کے لیے ہوتی ہے اور ہیئر فورس بھی یہی کام کرتی ہے۔ یعنی سر کو بالوں سے بلند کر رہی ہے۔ ہم افغانستان گئے تو نہیں کیونکہ تاحال ہمارے بال ہیں‘ لیکن ہم نے وہاں کی تصویریں دیکھی ہیں جس سے لگتا ہے ہیئر فورس نے وہاں کے چوکوں میں

"چوکیاں" ڈال رکھی ہیں۔ ہر گزرنے والے کے بال ماپتے ہیں۔ جو مقررہ طالبان حدود کی خلاف ورزی کرتے نظر آئیں ان پر طالبان ہیر فورس ٹوٹ پڑتی ہے۔

تاریخ کے "سر" سری مطالعے سے ہمیں ہیر فورس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔ البتہ تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ جو کسی کے آگے سر نہ جھکاتے تھے۔ ہیر کٹنگ فورس کے آگے وہ بھی سرنگوں ہوتے تھے۔ اکبر بادشاہ کو بھی سر جھکانا پڑتا' کیونکہ اس کے بغیر حجامت ممکن نہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ سکھ مذہب سے پہلے حجاموں کا راج ہو گا' کیونکہ یہ مذہب متواتر ہی حجاموں کے خلاف ہے۔ اس میں آپ بال نہیں منڈوا سکتے۔ سو سکھوں میں حجام پتہ نہیں کیسے گزارا کرتے ہوں گے۔ ہمارے دیہاتوں میں آج بھی بڑے بوڑھے کسی نوجوان کے بال لمبے دیکھیں تو حجام کو بلا کر منڈوا دیتے ہیں۔ لیکن طالبان حکومت کے لیے اتنے حجام امپورٹ کرنا ممکن نہ تھا۔ سو انہوں نے دست بدست لڑائی کرنے والے فوجیوں کو یہ اضافی ذمہ داری دے دی۔ اس لیے وہ لمبے بالوں پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے اسلام کفر پر۔ ویسے دست بدست لڑائی کے تو ہر کوئی قابل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جنگ عظیم کے دوران جب انگریزوں نے جبری بھرتی شروع کی تو ایک میراثی اس ڈر سے کہ کہیں مجھے بھرتی نہ کر لیا جائے' طبی معائنے میں یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اس پر فوجی کمانڈر نے کہا "اسے دست بدست لڑائی کے لیے بھرتی کر لو۔"

ہمارا حساب بچپن ہی سے کمزور تھا۔ دماغ ایسا تھا کہ جو کچھ تقسیم کرنے والا ہوتا' ہم اسے بھی اپنے پاس جمع کر لیتے۔ اس پر ہمارے ٹیچر نے والد صاحب سے کہا کہ آپ کا بیٹا کچھ نہیں بن سکتا سوائے سیاست دان کے۔ اس کے دماغ پر بالوں کا جو بوجھ ہے وہ نہ رہے تو شاید دماغ چلنے لگے۔ سو ہماری روزانہ ٹنڈ کرائی جانے لگی۔ صبح ناشتے کے ساتھ حجام آتا' جو ہمارے سر پر اس طرح استرا پھیرتا جیسے وہ حجام کی بجائے مالی ہو۔ سردیوں کے دنوں میں حجام کو صبح صبح اٹھنا پڑتا۔ سو وہ اس سحر خیزی کا غصہ ہمارے سر پر نکالتا اور اکثر سر پر ٹک لگا دیتا۔ ہم ہر ٹک پر روتے تو والد صاحب ہمیں ہر ٹک کا روپیہ دیتے۔ کبھی کبھی تو تیس تیس کی دیہاڑی لگتی۔ ہم سے پہلے اس حجام کا دماغ چل گیا اور

اس نے ٹنڈ کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ اب کسی اور کو "جاچ" سکھائیں میں نے تو کام سیکھ لیا ہے۔ ہو سکتا ہے طالبان ہر سر کے بال اس لیے مونڈھ رہے ہیں کہ بالوں کا بوجھ ہٹے اور قوم کو عقل آئے۔ اگرچہ ٹنڈ کرنے سے عقل آتی تو ہیر فورس کو آتی جو دن میں کئی کئی ٹنڈیں کرتی ہے۔ طالبان کٹ ابھی دنیا میں پاپولر تو نہیں ہوئی' لیکن ہمیں امید ہے کہ پاپ سنگرز میں ہٹ ہو گی۔ پاپ سنگرز کے بالوں کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا ہے کہ یا یہ خود کاٹتے ہیں یا پھر کسی نے ان کا گانا سننے کے بعد ان کے بال کاٹے ہیں۔ مغربی میڈیا ہم مشرقیوں کے ہر کام کو برے انداز میں پیش کرتا ہے۔ جیسے وہ شور مچا رہے ہیں کہ ہمیشہ لگتا ہے کہ اس طرح بال کاٹنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ ہمیں یہ تو نہیں پتہ کہ کس طرح بال کاٹنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں لگتا ہے چونکہ طالبان ہیر فورس یہ بال مفت کاٹ رہی ہے' اس لیے اسے پسند نہیں کیا جا رہا' ورنہ ایسے بال کٹوانے کے لیے بڑے پارلروں پر پہلے سے ٹائم لینا پڑتا ہے۔ یہی نہیں کئی پونڈ لگتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ کٹنگ سے اس کے تیس پاؤنڈ کم ہوئے۔ ہم نے کہا آپ کا اتنا وزن کم ہوا تو نہیں لگتا۔ اگر ہوا ہے تو کہاں سے؟ بولا "جیب سے" "بی بی سی اس ہیر فورس کے خلاف یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ یہ بالوں کے خلاف ہیں۔ حالانکہ بندہ افغانستان میں کھانے کے بغیر رہ سکتا ہے۔ داڑھی کے بغیر نہیں۔ وہاں کا آدھا حسن داڑھی میں لپٹا ہوا ہے۔ دنیا میں داڑھی کا فیشن بڑھ رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عورتوں کو داڑھی پسند ہے' لیکن ہمیں اس کا یقین نہیں کیونکہ اگر عورتوں کو داڑھی پسند ہوتی تو ان کی ہوتی۔ افغانستان میں اتنی لمبی لمبی داڑھیاں ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طالبان بالوں کے خلاف ہیں۔ وہاں تو جس کی داڑھی نہ ہو اسے سرکاری ملازمت سے چھٹی کروا دیتے ہیں۔ وہ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ بال سر سے بلند نہ ہوں۔ وہ صرف سر کے بالوں کے خلاف ہیں۔ ان کے اس اقدام سے دنیا بھر کے گنجوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کیونکہ اگر کسی کے سر پر بھی بال نہ ہوں گے کوئی گنجا نہ ہو گا تو کوئی گنجا نہ رہے گا۔

دوبئی دو بھئی

سفر میں یہی خوبی ہے کہ یہ ختم ہو جاتا ہے‘ لیکن سفر کے ختم ہونے کے بعد بھی ہمیں ایک ہفتہ یہی لگا کہ سفر میں ہی ہیں۔ سو آج کل بھی ہم ”سفرنگ فرام سفر“ ہیں۔ قطر میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے ہونے والی تقریبات میں ایک تقریب فکاہیہ کالم نگاری کے حوالے سے تھی‘ جس میں شرکت کے لیے ہم اور ناروے میں پاکستان کے سفیر عطاء الحق قاسمی قطر پہنچے بلکہ ہم پہنچے عطاء الحق قاسمی

صاحب تو تشریف لائے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب ہمارے ہی استاد نہیں ویسے بھی استاد ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے ایک ہی ملاقات میں بندے کو محبت ہو جاتی ہے‘ جسے کم کرنے کے لیے انہیں کئی بار ملنا پڑتا ہے۔ ہمارے کالم نگار اجمل نیازی دیکھنے میں ایسے ہیں کہ ٹی وی پر بچے ان کی تصویر دیکھ لیں تو جا کر امی سے کہیں گے ”امی امی دیکھیں امرتسر کتنا کلیئر آرہا ہے۔“ لیکن عطاء الحق قاسمی کو دیکھ کر پاکستان کلیئر نظر آتا ہے۔ کبھی کسی جابر کے سامنے نہیں جھکے۔ ان کے کسی کے سامنے نہ جھکنے کی وجہ معالجین اور مخالفین ان کی کمر کا درد بتاتے ہیں۔ ان کے سفیر بننے پر ادیب شاعر اتنے خوش ہوئے اتنے تو کسی بزرگ ادیب شاعر کی شادی پر اس کے ہمسائے خوش نہیں ہوتے۔ سفیر بننے سے پہلے ان کی یہ حالت تھی کہ ہم نے امجد اسلام امجد سے پوچھا ”ان کے لباس کے بارے میں بتائیں؟“ امجد صاحب بولے ”پہن لیتے ہیں۔“ لیکن سفیر بننے کے بعد سے وہ سخت گرمی میں بھی تھری پیس میں نظر آتے ہیں۔ اس موسم میں ہم نے مصطفیٰ کھر کو فور پیس میں بھی دیکھا ہے۔ تھری پیس انہوں نے پہنا ہوتا اور ایک پیس ساتھ ہوتا۔ عطاء الحق قاسمی صاحب نے وہاں جو کالم پڑھ کر سنایا‘ اس نے شروع میں ہنسایا اور بعد میں رلایا۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے ہنسنا کتنی ہچکیوں کے بعد سیکھا۔

پاکستان پچاس برس کا ہو گیا ہے لیکن پچاس برس کا لگتا نہیں۔ حالت اور حلیئے سے سو سال کا لگتا ہے۔ ان پچاس سالوں میں ہم نے مزاح نگاری میں بڑی ترقی کی۔ یقین نہ آئے تو بڑے بڑے سیاستدانوں کے بیان پڑھ لیں۔ ان پچاس سالوں میں ہم نے ٹیکنالوجی میں بڑی ترقی کی۔ دنیا میں جو تین شپ مشہور ہوئے جن میں ایک برطانیہ کا الزبتھ شپ‘ دوسرا فرانس کا آرمیڈا شپ اور تیسرا پاکستانی سنسر شپ ہے۔ ان پچاس سالوں میں ہم نے جس شعبے میں سب سے زیادہ ترقی کی وہ ہے قرضہ لینا۔ ان پچاس سالوں میں ہماری وہ قابل فخر پیداوار جو ہمیشہ ایکسپورٹ کوالٹی کی رہی وہ پاکستانی ہیں۔ اللہ کا فضل ہے ہم نے پچاس سالوں میں اس پیداوار میں کئی ملکوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اگر یہی رفتار رہی تو اگلی صدی میں ہم آبادی کے لحاظ سے دنیا کے بہت بڑے ملک ہوں

گے، لیکن بقول عطاء الحق قاسمی گولڈن جوبلی پاکستان کی پچاسویں سالگرہ ہے اور ہم جب کسی کی سالگرہ مناتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ پچھلے سال اس کی تائی مر گئی۔ اس کا پھوپھا قریب المرگ ہے۔ پچھلے سالوں میں جو سانحے ہوئے ہوتے ہیں وہ گنوانے نہیں بیٹھ جاتے، کیونکہ سالگرہ خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ اس پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس سفر سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ پاکستان سے باہر مقیم پاکستانی جتنا پاکستان سے پیار کرتے ہیں اتنا ہم پاکستان میں رہنے والے کریں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں۔ قطر جو اتنا سا ہے کہ ہمیں عرب کی ایک کتر لگا، لیکن وہاں پاکستانیوں نے اپنا بڑا وسیع حلقہ بنا رکھا ہے۔ قطر کے بعد ہم دوبئی پہنچے تو حیران ہو گئے۔ جیسے جہاز کسی عرب ملک کی بجائے یورپ میں جا اترا ہو۔ وہاں غیر ملکی عورتوں کی تعداد اور ان کے لباس دیکھ کر یہی لگتا تھا ہم مسرت شاہین کی پشتو فلم دیکھ رہے ہیں۔ کہیں کہیں کوئی مقامی عربی اپنے لباس میں نظر آتا تو یوں لگتا جیسے یہ عربی یہاں سیر کرنے آیا ہے۔ دوبئی متحدہ عرب امارات کی ایک ریاست ہے۔ ہمیں تو متحدہ عرب امارات متحدہ عرب عمارات ہی لگا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، امارتیں ہی امارتیں۔ پورا دوبئی دو بھئی ہے۔ ایک شاپنگ پلازہ جہاں یورپ کی طرح سب کچھ بکتا ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے بارے میں لکھا تھا کہ ہم انہیں بہت بڑا شاعر مانتے تھے لیکن ایک دن ہم نے ان کا کلام پڑھ لیا۔ ایسے ہی دوبئی کو ہم عرب علاقہ سمجھتے تھے، لیکن پھر ہم نے دوبئی کا ایک چکر لگا لیا۔

ہاٹ لائن

جب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ نواز شریف اور اندر کمال گجرال کے لیے ہاٹ لائن "بچھا" دی گئی ہے، تب سے ہم سوچ رہے ہیں وہ اس پر کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ نواز شریف کو توگانا، گجریلا اور گجرال پسند ہیں، جبکہ گجرال اس عمر میں ہیں جس میں بندہ ہر کسی کو پسند کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک اپنی بیوی کو بھی۔ سو ہمارا خیال ہے نواز شریف کشمیری کھانوں کی باتیں کرتے ہوں گے، کیونکہ انہیں توگانا بھی اس لیے پسند ہے کہ یہ

بھی غذا ہے روح کی ہی سہی۔ جبکہ گجرال شعر سناتے ہوں گے کہ جب کچھ نہ کہنا ہو تو پھر شعر کہنے میں کیا حرج ہے؟

زمانہ تیز ہو گیا ہے۔ جتنی غلطیاں پہلے آپ پانچ دنوں میں کرتے تھے اب پانچ منٹ میں کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے چند سالوں تک فائیو سٹار ہوٹلوں کے بیرے کھانا رکھنے کے بعد کہا کریں گے 'یہ میرا پیجر نمبر ہے اگر چائے کافی چاہیے ہو تو بتا دیجئے گا۔ اس دور میں سربراہوں کے لیے سادہ ہاٹ لائن سے بڑھ کر کچھ ہونا چاہیے۔ ایک وہ نمبر جو ہمیں کبھی انگیجڈ نہیں ملا وہ رانگ نمبر ہی ہے۔ ہاٹ لائن پر تو یہ سہولت بھی میسر نہیں ہوتی۔ پھر اسے ہاٹ پتہ نہیں کیوں کہتے ہیں۔ ہمارے ایک جاننے والے کے بچے نے فون کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا لگتا ہے میری ممی زیادہ دور نہیں گئیں کیونکہ ابھی تک فون ہاٹ ہے' لیکن ہاٹ لائن پر تو ٹھنڈ رہتی ہے۔ مٹی کے برتنوں تک کا بھی فائدہ شاید سردیوں میں ہوتا ہے۔ کمیونزم کے دور میں مغربی صحافی روس کے اخبار پراودا کے چیف ایڈیٹر کے دفتر میں گئے تو انہوں نے عجیب سا فون دیکھا' جس میں ماؤتھ پیس ہی نہیں تھا' صرف سننے والا حصہ تھا۔ صحافی نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" تو چیف ایڈیٹر بولا "یہ ہمارا کریملن سے ہاٹ لائن پر رابطہ ہے۔" بھارت کا ہاٹ لائن پر جو سیٹ پڑا تھا وہ بھی برسوں سے خراب تھا۔ اب حالات بدلے ہیں تبدیلیوں کا دور ہے۔ ملک معراج خالد کے دور کا لطیفہ ہے۔ تین دوست بیٹھے تھے۔ ایک نے کہا "میں کتنا بدل گیا ہوں۔ پہلے کتنا موٹا ہوتا تھا' چند سال قبل میں نے جوگنگ شروع کی' اب سو میٹر ریس کا اچھا کھلاڑی ہوں۔" دوسرا بولا "مجھ میں بھی بڑی تبدیلی آئی۔ کالج کے زمانے میں کتنا ایماندار اور منہ پر سچ کہنے والا تھا' آج کل ٹی وی پر خبریں پڑھتا ہوں۔" تیسرا بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے دیکھو مجھ میں ملک کے لیے کام کرنے کا کتنا جذبہ ہے۔ دن رات کام کرتا نہ تھکتا' آج میں وزیراعظم ہوں۔" لیکن نواز شریف تو کچھ کر گزرنے کا نام ہے۔ اسی لیے لوگ ہر گھنٹے کے بعد پوچھتے ہیں "نواز شریف اور مزار شریف کی تازہ ترین صورت حال کیا ہے۔" وہ پاکستان اور بھارت کو قریب لانا چاہتے ہیں۔ محسنہ خان بھی بھارت کو اتنا قریب لے آیا تھا کہ اس کا نتیجہ "جنت" کی صورت میں اب بھی اس

کے گھر ہے۔ نواز شریف اس طرح "جنت نظیر" چاہتے ہیں۔ نواز شریف کی مقبولیت میں چند سالوں میں مہنگائی کی طرح اضافہ ہوا ہے' جبکہ گجرال کی سیاسی حیثیت کا اندازہ اس سے لگالیں کہ وہ اپنی حیثیت جاننے اور معلوم کرنے کہ کتنا مقبول ہوں' اپنے علاقے کے پان فروش کے پاس گئے اور پوچھا مجھے جانتے ہو تو وہ بولا "آپ کو کون نہیں جانتا' آپ نریش کے والد ہیں۔" نواز شریف کو گجرال شاید اس لیے پسند ہیں کہ نواز کو میڈان پاکستان چیزیں بہت پسند ہیں۔ ان کے لیے وطن کی مٹی نوٹوں سے مہنگی ہے۔ یہ ہے بھی ٹھیک۔ خواجہ طارق رحیم سے پوچھ لیں۔ آپ ایک سال اگر مٹی اور کرنسی کو رکھیں تو کرنسی کی قیمت کم ہو چکی ہو گی اور مٹی کی بڑھ جائے گی۔

گجرال حساب "کتاب" کے بندے ہیں جبکہ نواز شریف صرف حساب کے بندے ہیں۔ گجرال سے بچپن میں سائنس ٹیچر نے پوچھا "جب برف بنتی ہے تو اس میں کیا تبدیلی ہوتی ہے۔" بولے "اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔" سو ہمارا خیال ہے کہ وہ خود تو ہاٹ لائن سے کبھی فون نہیں کریں گے کیونکہ ہندو کو پتہ ہوتا ہے بیرون ملک کال کرنے پر کتنا خرچہ آتا ہے۔ ہندو پورے دن میں چند منٹ کے لیے بھی سکھ نہیں ہوتا۔ بشن سنگھ بیدی بتاتے ہیں جب آنجہانی گیانی ذیل سنگھ نے بھارت کے صدر کا عہدہ سنبھالا تو اس کے چند روز بعد ان کے آبائی گاؤں سے تعلق رکھنے والے لوگ انہیں ملنے راشٹرپتی بھون آئے۔ گیانی ذیل سنگھ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور خاطر تواضع کے بعد آنے کا مقصد پوچھا تو ایک مہمان بولا "ہم صرف کرٹسی کال کے لیے حاضر ہوئے تھے۔" آنجہانی نے میز پر پڑے ٹیلیفون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایہہ پیا جے جنھیاں مرضی کالاں کرو۔"

گجرال دانشور ہیں۔ دانشور وہ ہوتا ہے جس کی قوت عمل اس کی قوت فیصلہ سے کمزور ہو' لیکن ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ان کی کمزور یادداشت ہے۔ وہ شیلا گجرال کی نظمیں سن کر بھی یوں داد دیتے ہیں جیسے کسی ہمسائے کو داد دے رہے ہوں۔ قدرت کا معاملہ بھی عجیب ہے جس عمر میں یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے' اس عمر میں یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے۔ دیکھنے میں وہ پروفیسر لگتے ہیں اور پروفیسر

اپنی ذات میں پوری کلاس ہوتے ہیں جو پروفیسر بھلکڑ نہ سمجھا جاتا ہے وہ اپنے پیشے سے کمیٹیڈ نہیں جب وہ امور خارجہ کے وزیر بنے تو انہوں نے ڈرگ انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا کی بنائی "میموری پلس گولیاں" کھانا شروع کر دیں جس کے نام کا ترجمہ کسی نے "یادداشتہ" کیا حالانکہ یہ گولیاں اتنی بھی کڑوی نہیں بہر حال ان کی یادداشت اتنی بہتر ہو گئی کہ مسئلہ کشمیر تک یاد آ گیا ورنہ اس سے قبل کوئی کشمیر جنت نظیر کا ذکر کرتا تو وہ سمجھتے علامہ اقبال کی نظم پر بات کر رہا ہے۔ لیکن وزیر اعظم بنتے ہی ملکی مفاد کی خاطر انہوں نے یہ گولیاں کھانا بند کر دیں۔ ہمارے شاعر روحی کنجاہی کی طرح جنہوں نے ہیرنگ ایڈز لگا رکھا ہے' جسے وہ اس وقت لگاتے ہیں جب اپنے شعر سنا رہے ہوں تاکہ داد لینے میں آسانی رہے' لیکن دوسروں کے شعر وہ ہیرنگ ایڈز اتار کر سنتے ہیں تاکہ داد دینے میں آسانی ہو۔ سوہاٹ لائن پر گفتگو کرتے ہوئے گجرال یہ بھول جائیں گے کہ کس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ موضوع یاد آئے گا تو یہ یاد نہ ہو گا کس سے بات کر رہے ہیں۔ ویسے بھی ہندوؤں کی یادداشت ایسی ہوتی ہے کہ انہیں تو یہ بھی یاد ہوتا ہے کہ کیا بھولنا ہے۔

علمائے کرائم

ہمیں جب سے پتہ چلا ہے کہ پولیس علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کو تلاش کرتی پھر رہی ہے' ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ پولیس کا ذوق بھی بہتر ہوا ہے ورنہ اس سے قبل تو چوروں ڈاکوؤں کے پیچھے ہی ہوتی تھی۔ اہل دانش کی طرف متوجہ ہونا خوش آئیند ہے۔ ہم سمجھتے ہیں پولیس کا مقابلہ یہ ہے کہ اسے بدمعاش لٹیروں اور حکمرانوں کی صحبت میں رہنا پڑتا ہے اور آپ کو پتہ ہے صحبت کا اثر تو ہوتا ہے سو

ہمارا خیال تھا کہ پولیس کو سدھارنے کے لیے تھانوں میں زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے، دانشور اور شریف شرفاء کو رکھنا چاہیے تاکہ پولیس کی صحبت بہتر ہو۔ جیسے بندہ بیک وقت ایک کام کر سکتا ہے۔ بول سکتا ہے یا سن سکتا ہے۔ ایسے ہی حکومت ایک وقت میں سوچ سکتی ہے یا کچھ کر سکتی ہے اور موجودہ حکومت کچھ کرنے کے لیے آئی ہے۔ پہلے حکومت نے گرد اور دہشت گرد مکانے پر توجہ دی۔ وزیراعلیٰ نے کہا "ہم دہشت گردوں کو نہیں چھوڑیں گے۔" لیکن جیسے کسی نے پوچھا "توبہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کیا ضروری ہے؟ جواب ملا "گناہ کرنا" ایسے ہی دہشت گردوں کو نہ چھوڑنے کے لیے پہلے انہیں پکڑنا ضروری ہے۔ بہرحال جب سے صدر پاکستان رفیق تارڑ صاحب نے فرمایا کہ ہم رمضان کے مقدس مہینے میں کسی کو مسلمان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس کے بعد سے دہشت گردی بھی گرد ہو چکی، کیونکہ رفیق تارڑ صاحب بات کے پکے ہیں۔ جب بھی دہشت گرد ان کے پاس خون بہانے کی اجازت لینے جائیں گے وہ انہیں یہ ہرگز نہ دیں گے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے پہلے بچے الف سے انار پڑھتے تھے۔ اب الف سے اباجی پڑھتے ہیں، لیکن جیسے سائنس اتنی ترقی کے باوجود ابھی دو چیزوں پر کنٹرول نہیں پاسکی۔ ایک موسم اور دوسرا عورتیں، ایسے ہی حکومت ابھی تک پولیس اور پولیو سے بروقت حفاظتی بچاؤ کا انتظام نہ ہونے کے باعث کئی لوگوں کو معذور ہونے سے نہیں بچاسکتی۔ سو دونوں شعبوں پر حکومت توجہ دے رہی ہے۔ تعزیت ناموں کے حساب سے تو آج تک کسی کو بروقت موت نہیں آئی، لیکن علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی بے وقت موت کے قائل ہو گئے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو پولیس تک میں اپنی پاپولرٹی دیکھ کر کتنا خوش ہوتے کہ وہ علماء کرام میں ہی نہیں علماء کرائم میں بھی بلند مقام حاصل کر گئے۔

پولیس کا تعلق مجرموں سے بہت قریبی ہی سہی، لیکن کتابوں سے بھی دور کا نہیں۔ ہر کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہوتا ہے۔ بعد میں کئی ہو سکتے ہیں۔ بعض کتابیں تو نرا مقدمہ ہی ہوتی ہیں، جیسے الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ ہمارا ایک حوالدار بھی ایسا مقدمہ لکھ سکتا ہے جیسا آج تک ظفر اقبال نے فرحت عباس

شاہ کی کسی کتاب کا نہ لکھا ہو گا پھر اس معاشرے میں پولیس کا اتنا ہی احترام ہے جتنا شاعروں کا ہے۔ فیض احمد فیض صاحب کے حوالے سے ایک صاحب بتا رہے تھے کہ فیض صاحب کا معاشرے میں اتنا مقام تھا کہ ایک بار انارکلی میں انہوں نے ریڑھی والے سے سیب لیے تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ سن کر پاس کھڑے ایک تھانیدار نے کہا "معاشرے میں فیض احمد فیض جتنا مقام تو ہمارا بھی ہے ہم بھی کسی ریڑھی والے سے پھل خرید لیں تو وہ پیسے لینے سے انکار کر دیتا ہے۔" ایک تھانیدار کو اختر شیرانی بہت پسند تھے۔ وہ ہمسائے سے ایک بندہ بلا کر اس سے اختر شیرانی کے شعر سنتے۔ وہ صاحب اختر شیرانی کے ہر شعر کے بعد اس کا مطلب ان لفظوں میں بتاتے کہ شاعر محبوبہ سے وصال چاہتا ہے۔ ایک دن وہ صاحب بڑے غمزدہ آئے اور کہا "چودھری صاحب! اختر شیرانی کا وصال ہو گیا ہے۔" اور رونے لگے۔ تھانیدار نے غصے سے کہا "اوئے تم تو یوں رو رہے ہو جیسے اختر شیرانی کا وصال تمہاری محبوبہ سے ہوا ہے۔" ایک خاوند ایسے ہی تھانیدار کے پاس گیا اور اپنی بیوی کے اغوا کی رپٹ درج کرانا چاہی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اس کی بیوی کو میر و غالب بہت پسند تھے۔ تھانیدار نے فوراً سپاہیوں سے کہا "فوراً جا کر مسمی میر و غالب کو پکڑ کر تھانے لاؤ۔" اب تو حکومت بھی ماننے لگی ہے کہ قلم تیز چلتا ہے کلاشنکوف سے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قلم کوف کو اتنا بھی طاقتور نہ سمجھا جائے کہ آئندہ کلاشنکوف کی طرح اسے بلا لائسنس رکھا نہ جاسکے۔ حالانکہ خانہ بگوش تو لکھ چکے ہیں کہ اگر تانگہ چلانے کے لیے لائسنس ضروری ہے تو قلم چلانے کے لیے کیوں نہیں۔ پھر یہ تو حکمران بھی مانتے ہیں کہ قلم کلاشنکوف سے مفید ہے۔ ظاہر ہے کلاشنکوف سے شلوار میں نالا تو نہیں ڈالا جاسکتا۔ آئن سٹائن سے کسی نے پوچھا "آپ نے ایسے بڑے نظریے پیش کیے، جن سے تاریخ، سائنس اور فکر انسانی متزلزل ہو گئی، لیکن آپ کی کوئی لیب نہیں۔" تو آئن سٹائن نے جیب سے قلم نکال کر کہا "یہ ہے میری لیب۔" موجودہ دور میں اہل قلم کی قدر و "قیمت" بڑھی ہے۔ آج کل "قیمتی" اہل قلم میں سے نمبرون پولیس والے ہیں۔ وہ ایک مقدمہ لکھنے کے جتنے پیسے لے لیتے ہیں، اتنے اے حمید کو بھی پوری کتاب

لکھنے کے نہ ملتے ہوں گے۔

اگرچہ کہا یہ جارہا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ میں کچھ سطریں اس نیت سے شامل کیں کہ جب پنجاب میں شہباز شریف صاحب کی حکومت بنے تو یہ انہیں نقصان پہنچائیں' لیکن ہم سمجھتے ہیں ان دو مصنفین کو اس لیے تلاش نہیں کیا جارہا بلکہ پولیس استفادہ چاہتی ہے۔ جیسے اس نے حمید جہلمی اور جمیل چشتی صاحب کو گرفتار کر کے ان سے کیا۔ اگر پولیس علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کو پکڑنا چاہتی تو یہ ہماری پولیس کے دائیں ہاتھ کا کام تھا۔ دائیں ہاتھ کا اس لیے کہ اسی ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک شیخ کا جنگل میں پالتو ہاتھی گم ہو گیا۔ اس نے اس کی تلاش کے لیے کئی ملکوں کی پولیس کی خدمات حاصل کیں۔ ہر ملک کی پولیس جنگل میں جاتی اور ناکام لوٹ آتی۔ آخر پاکستانی پولیس کا ایک ایس ایچ او اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ جنگل میں گھسا اور آدھ گھنٹے بعد ہی وہ ایک بارہ سنگے کے ساتھ برآمد ہوا۔ سپاہی بارہ سنگے کی چھترول کر رہے تھے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "ہاں ہاں میں ہی ہاتھی ہوں۔" سو صاحب حمید جہلمی اور جمیل چشتی کو تو پولیس نے اس لیے پکڑا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ایک شام منا سکے۔ اگر مقصد سید سلیمان ندوی اور علامہ شبلی نعمان کی برآمدگی ہوتا تو کیا مشکل تھی۔ صبح تک خود حمید جہلمی اور جمیل چشتی صاحب چلّا چلّا کر کہہ رہے ہوتے "ہاں ہاں ہم ہی سید سلیمان ندوی اور علامہ شبلی نعمانی ہیں۔"